اسلام اور عورت

مولانا محمد منظہر الدین صدیقی

اسلام اور عورت

مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اس میں شک نہیں کہ کتاب بہترین رفیق ہے۔ مطالعے سے نہ صرف ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے بلکہ شعور بھی پختہ ہوتا ہے مسلسل مطالعے سے غور و فکر کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ادارۂ خرام نے صاحب ذوق حضرات کے مطالعے کے لئے پاکیزہ اور صحت مند لٹریچر چھاپنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اور اشاعتی پروگرام بہت وسیع پیمانے پر ترتیب دیا ہے جس میں عمدہ ناولوں کے ساتھ ساتھ ادبی اور مذہبی کتب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں اردو زبان کے مشہور و مؤقر مصنفین کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں۔

خدا کرے ارکانِ ادارہ کا عزم قائم رہے اور کامیابی ان کے قدم چومے۔

زیر نظر کتاب "اسلام اور عورت" اپنے موضوع پر ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔

بہار، الہ آبادی (دہلی)

فہرست مضامین

اسلام اور مساوات جنسی

مساوات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی صحیح طور پر تعریف کرنا بہت دشوار ہے۔ ایک معنی کر کے تمام انسان ایک دوسرے کے مساوی ہیں لیکن جب ہم عملی زندگی کے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دو آدمی بھی ایسے نہیں جو ہر اعتبار سے باہم مساوی ہوں۔ ہر انسان کا اپنا ایک مذاق ہوتا ہے وہ ایک جداگانہ طبیعت لے کر عالم وجود میں آتا ہے۔ اس کے قوائے جسمانی اور دماغی اور اس کی ذہنی و روحانی صلاحیتیں دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہیں پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اختلاف بالکلیہ ماحول اور تربیت کے پیدا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی حقوق اور ذمہ داریوں اور معاشرہ میں انسان کا انفرادی رتبہ متعین کرنے میں پیدائشی اختلافات کو بڑا دخل ہے۔ انسان کی بنیادی وحدت و مساوات کو اصولی حیثیت سے تسلیم کرنے کے باوجود یہ امر عملاً ناممکن ہے کہ افراد کے

باہمی فرق و اختلافات کو بالکل مٹا دیا جائے اور ان فروق و اختلافات سے جو عدم مساوات پیدا ہوتی ہے اسے یکسر محو کر دیا جائے۔ عدم مساوات کی وجہ سے جو مظالم اور ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب انسانوں کی فطری اور پیدائشی عدم مساوات میں معاشرہ اپنی طرف سے مصنوعی عدم مساوات کا اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ مصنوعی عدم مساوات جو بالآخر ظلم اور اتلاف حقوق کی جانب لے جاتی ہے، غیر فطری رسم و رواج اور پارینہ روایات کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ جب یہ غیر فطری بندشیں اور مصنوعی پابندیاں کسی معاشرہ میں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو اس کے تمام افراد خواہ مرد ہوں یا عورتیں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو نشوونما دینے میں رکاوٹیں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہنی اور روحانی ارتقاء مسدود ہو جاتا ہے۔ ان کے بلند تر عزائم اور اعلیٰ حوصلے ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، یہ کام مذہب، حکومت اور قانون کا ہے کہ وہ انفرادی نشوونما کی راہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کریں اور ایک ایسا ماحول پیدا کریں جس میں صرف انسان کی پیدائشی صلاحیتوں کا فرق و اختلاف معاشرہ میں ان کا رتبہ متعین کرے۔

جنسی مساوات کے مسئلہ پر بھی اسی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے۔ اگر جنسی مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کی دقیانوسی روایات، مصنوعی رسوم اور ایسے تمام قوانین جن کی اسلام میں کوئی حقیقی سند موجود نہیں، اور جو غیر مسلموں کے میل جول، یا مخصوص قومی اور ملکی حالات کی پیداوار ہیں ہمارے معاشرے سے خارج کر دیے جائیں تاکہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی موقع حاصل ہو کہ وہ اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں اور مسلمان سوسائٹی کی ترقی میں اپنا جائز حصہ لے سکیں تو بجز چند قدامت پرستوں کے اور کسی سمجھدار شخص

کو اس قسم کی مساوات سے انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر جنسی مساوات کے معنی یہ لئے جائیں کہ صنفِ نازک کے جسمانی خصوصیات۔ نفسانی میلانات اور ذہنی صلاحیتیں بعینۂ اور ہو بہو مردوں کی مانند ہیں، یا مرد اور عورت ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کرتے، بلکہ ایک مشترک میدان عمل میں باہم حریفانہ حیثیت رکھتے ہیں، اور ہر وہ کام جو مردوں کے کرنے کا ہے عورتیں بھی اُسی حسن و خوبی سے انجام دے سکتی ہیں۔ یا مرد بھی عورتوں کے وظائف انجام دے سکتے ہیں، تو اس قسم کی جنسی مساوات بالکل غیر حقیقی اور ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک مرد و عورت کی بنیادی مساوات کا تعلق ہے۔ قرآن مجید میں ایک جامع آیت میں اس کا اثبات کر دیا ہے۔

یا ایھا الناس اتقو ربکم الذی خلقکم من نفس
واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا
ونساء۔ (سورہ نساء)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک نفس واحد سے پیدا کیا۔ پھر اس نفس واحد سے انسان کا جوڑا پیدا کیا یعنی صنفِ نازک کی تخلیق بھی اسی نفس واحد سے عمل میں آئی۔ جس سے مرد کو پیدا کیا گیا۔ یہاں نہ صرف مردوں اور عورتوں کی اصولی مساوات کا اعلان کیا گیا ہے بلکہ سارے انسانوں کو بلا امتیاز نسل وخون اور قومیت مساوی قرار دیا گیا کیونکہ سب کے سب بالآخر اسی نفسِ واحد کی پیداوار ہیں۔ اس جامع قرآنی آیت کے بعد جس میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا صاف لفظوں میں اثبات کیا گیا ہے۔ اگر کوئی حدیث یا روایت ہمیں ایسی ملتی ہے جس سے قرآن کے اس اعلان کی براہِ راست یا بالواسطہ تکذیب ہوتی ہے تو ایسی حدیث یا روایت لائق

استثنا دنہیں مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ اسی طرح ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہو سکتی ہے تو گھوڑے۔ عورت۔ اور مکان میں۔ یہ دونوں حدیثیں قرآن کے اعلانِ مساوات کی صریحاً تکذیب کرتی ہیں اور اس نے انھیں حضور رسالت مآب کی جانب منسوب کرنا منصب نبوت کی "تذلیل" اہانت ہے۔

عربوں کی تاریخ کے جس عہد میں اسلام منظر وجود پر نمودار ہوا۔ اس میں عورتوں کی حیثیت بہت پست اور حقیر تھی، انھیں نہ صرف مردوں سے کم مرتبہ قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب کسی مرد کا انتقال ہو جاتا تو اس کی بیویاں اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتی تھیں۔ گویا کہ وہ بھی کوئی جائیداد منقولہ ہیں، لڑکیوں کا پیدا ہونا اہلِ خاندان کے لئے باعث ننگ سمجھا جاتا تھا اور بہت سے لوگ اس ذلت کی شرمندگی کو چھپانے کے لئے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات نے اس غلط تصور کو مٹا دیا کہ لڑکیاں لڑکوں سے کم حیثیت اور کم رتبہ ہیں۔ یا لڑکے سلوک اور برتاؤ میں کسی ترجیح کے مستحق ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے عورتوں اور مردوں کے رتبہ کو مساوی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

احل لکم لیلۃ الصیام	رمضان کی شب میں تمھارے لئے
الرفث الی نسائکم۔	بیویوں سے ہمبستری حلال ہے کیونکہ
ھن لباس لکم و انتم لباس	وہ تمھارے لئے بمنزل لباس کے
لھن۔ (سورہ بقر)	ہیں اور تم ان کے لئے۔

چونکہ لباس سے انسان کے بعض جسمانی عیوب پوشیدہ ہو جاتے ہیں نیز لباس سردی اور گرمی میں انسانوں کو بیرونی فضا کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اس

لیے جہاں عورتوں کو مردوں کا لباس قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح مرد عورتوں کو برائیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان صفات کی تکمیل کرتے ہیں، جو عورتوں میں نہیں پائی جاتیں، اسی طرح عورتیں بھی مردوں کو فواحش سے روکنے کی موجب ہیں۔ اور مردوں میں جن صفات کی کمی ہے، انھیں پورا کرتی ہیں۔ یا اگر لباس سے آرائش و زینت مراد لی جائے تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح مرد کا وجود عورتوں کو زیب و زینت بخشتا ہے، اسی طرح عورتیں مردوں کے لیے باعث زینت ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد اور عورت بلحاظ مرتبہ مساوی ہیں۔ عربوں کی جیسی سوسائٹی میں جہاں عورت کو اتنا ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ اعلان انتہائی انقلاب انگیز تھا اور نہ صرف عربوں میں بلکہ یورپ کے ممالک میں ابھی سو دو سو سال ہوئے عورتوں کو جو حیثیت دی گئی تھی اس کے لحاظ سے قرآن کا اعلان مساوات مہذب دنیا کے معیارات سے بہت اونچا تھا۔ اسی طرح عربوں میں لڑکیوں کو جس ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، قرآن اس کی صاف الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے ان لوگوں کو نہایت کمینہ اور دنی الطبع قرار دیتا ہے۔ جو لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اور اس کے وجود کو اپنے خاندان کے لئے ایک بارِ گراں سمجھتے تھے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

واذا بشر احدھم بالانثیٰ	اور جب ان میں سے کسی کو
ظل وجھہ مسودا وھو کظیم۔	لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس
یتوارٰی من القوم من سوءِ	کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ
ما بشر بہ۔ ایمسکہ علیٰ	سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ اس خبر کی
ھون ام یدسہ فی التراب	برائی کی وجہ سے جو اُسے دی جاتی

الا ساء ما یحکمون ۔ (سورہ نحل)	ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلت کے لئے رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے ۔ سنو بہت بُرا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اِس خیال کی بھی قرآن ہی نے تردید کی کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ مرد آزاد ہے کہ اُن کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف ۔ (سورۂ بقرہ)	اور عورتوں کے بھی پسندیدہ طور پر ویسے ہی حقوق ہیں ، جیسے مردوں کے لیے۔

اسی اصول مساوات کی تعلیم دینے کے لئے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی کہ لڑکیوں کے ساتھ انھیں بالکل وہی برتاؤ کرنا چاہیئے جو لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل لڑکیوں کو ایک بار سمجھا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور کی جو عزت ہوتی تھی، لڑکیاں اس سے بالکل محروم تھیں، بلکہ آج تک مسلمانوں میں اس عدم مساوات کے بچے کھچے اثرات پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ لڑکوں کو اس لئے عزت و احترام اور شفقت و محبت کا مستحق سمجھتے ہیں کہ آگے چل کر ان سے خاندان کی معاشی سود و بہبود میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر ویسی توجہ نہیں کی جاتی جیسے لڑکوں کی تعلیم پر۔ کیونکہ لڑکیوں کی تعلیم سے خاندان کا کوئی ظاہری فائدہ نظر نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں سے منع فرمایا ہے اور صاف لفظوں میں حکم دیا کہ لڑکوں اور

بچوں کے ساتھ ہر معاملہ میں خواہ وہ کھانے سے متعلق ہو، تعلیم و تربیت سے متعلق ہو یا شادی بیاہ سے یکساں سلوک کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے:

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ولدت له ابنة فلم يؤذها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها يعني الذكور ادخله الله بها الجنة۔ (کنز العمال ۲۰۰)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہو اور وہ اُسے تکلیف نہ دے، نہ اس کی اہانت کرے اور نہ لڑکوں کو اس پر فوقیت دے، اللہ اس کی وجہ سے اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے:

عن ابی هريرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم عز وجل الجنة على كل آدمي يدخلها قبلي غير اني انظر عن يميني فاذا امرأة تبادرني الى باب الجنة فاقول مالهذه تبادرني فقال لي يا محمد هذه امرأة كانت حسناً جميلة كان لها يتامى فصبرت عليهن

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خدا نے ہر شخص کے لئے مجھ سے پہلے جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے۔ لیکن میں قیامت کے روز اپنی داہنی طرف ایک عورت کو جنت کے دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھوں گا۔ میں کہوں گا اسے کیا سوجھی کہ مجھ سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے مجھ سے کہا جائے گا کہ یہ ایک خوبصورت

حتیٰ بلغ امرھن الذی بلغ، فشکر اللہ لھا ذالک۔ (کنز العمال ۹ ۳۷)

بیوہ تھی۔ اس کی یتیم لڑکیاں تھیں۔ اس نے اپنی ساری خوبصورتی ان لڑکیوں کی تربیت کی بھینٹ چڑھا دی۔ یہاں تک لڑکیاں جوان ہوگئیں خدا نے اس کے اس فعل کی قدردانی کی۔ اسی قدردانی کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے اسی قسم کی ایک اور روایت مروی ہے:۔

عن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من کن لہ ثلاث بنات فعالھن واداھن وکفلھن وجبت لہ الجنۃ قیل و اثنتین قیل وواحدۃ قال وواحدۃ

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں، وہ ان کو پالے پرورش کرے اور ان کا کفیل ہو اس کے لئے جنت واجب ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر کسی کے دو لڑکیاں ہوں۔؟ آپؐ نے فرمایا، دو والے کے لئے بھی یہی بشارت ہے۔ پھر کسی نے کہا، اگر ایک لڑکی ہو اور اس کی کفالت کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا ایک لڑکی والے کے لئے بھی یہی بشارت ہے۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت اسی مضمون سے متعلق حسب ذیل ہے:۔

عن انسؓ قال قال رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
البنات من المشفقات
المجہزات المبارکات من
کانت لہ ابنۃ واحدۃ جعلہا
اللہ سترا من النار ومن
کانت لہ ابنتان ادخل الجنۃ
بہما ومن کانت عندہ
ثلاث بنات او مثلہن
من الاخوات وضع عنہ
الجہاد والصدقۃ ۔

حضرت انس کا بیان ہے کہ
حضورؐ نے فرمایا لڑکیاں بہت شفیق
لئیق اور باعثِ برکت ہوتی ہیں۔
جس شخص کی ایک لڑکی ہو، خدا اس
کو اپنے والدین کے لئے آتش جہنم
کی آڑ بنا دے گا، اور جس کی دو بیٹیاں
ہوں، اللہ ان کے سبب والدین کو
جنت میں داخل کرے گا اور جس کی
تین لڑکیاں یا تین بہنیں ہوں خدا
ان کے باعث صدقہ اور جہاد کی
ضرورت و فرضیت سے اُسے سُبک
دوش کرے گا ۔

حضرت جابر سے روایت ہے :

عن جابر قال قال
رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم من کان ثلاث بنات
یعولھن ویرحمھن فلہ بھن
الجنۃ ۔

حضرت جابر کا بیان ہے کہ
حضورؐ نے فرمایا جس شخص کی
تین لڑکیاں ہوں اور وہ ان کی
پرورش رحم و شفقت کے ساتھ
کرے وہ جنت میں جائے گا ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں :

عن ابن مسعود قال
قال رسول اللہ صلی اللہ

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ
رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا

عليه وسلم من كانت له ابنة فادبها فاحسن تاديبها و علمها فاحسن تعليمها فاوسع عليها من نعم الله التى اسبغ عليه كنت له منعة وسترا من النار۔

جس شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہو اور وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی اس پر بارش کرے تعلیم و تربیت اور حسن ادب سے اُسے بہرہ ور کرے، میں خود ایسے شخص کے لئے آتش جہنم کی آڑ بن جاؤں گا۔

مسلم کی اسی سلسلہ میں ایک روایت ہے :

من ابتلى بالبنات بشئٍ فاحسن اليهن اكن له سترًا من النار۔ (مسلم کتاب البر والصلة)

حضورؐ نے فرمایا جو شخص لڑکیوں کے باعث آزمائش میں ڈالا جائے وہ ان میں پورا اُترے اور اچھی طرح ان کی تربیت کرے میں آتش جہنم سے اس کی آڑ بن جاؤں گا۔

مساوات جنسی کے قیام کے لئے اسلام نے بار بار اس پر زور دیا کہ اولاد کے لئے ماں اور باپ دونوں کا مرتبہ برابر ہے۔ اگر عورت اور مرد کو خدا نے مساوی رُتبہ نہ دیا ہوتا تو ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا مطالبہ اس زور و شدّت سے نہ کیا جاتا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث میں ماں کی افضلیت پر بطور خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے :۔

ووصينا الانسان بوالديه احسانا حملته امه كرها ووضعته كرها۔

ہم نے انسان کو تعلیم دی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کی والدہ نے حمل کے

زمانے میں اس کو تکلیف سے اُٹھایا اور
اس کو پیدا کرنے میں بھی تکلف اُٹھائی۔

یہاں اگرچہ ماں اور باپ دونوں کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن ماں کی قربانیوں کا بطورِ خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک کی روایت ہے:

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم الجنۃ تحت اقدام الامہات۔	حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح حضرت فاطمہ سے مروی ہے:

عن فاطمۃؓ قالت قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم الزم رجلها فان الجنۃ تحت اقدامها	حضرت فاطمہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ماں کے قدموں سے چمٹ جاؤ کیونکہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

اس طرح اسلام نے عورتوں کو عزت و مساوات کا نیا مقام عطا کیا جہاں اس سے پہلے وہ کبھی نہیں پہونچی تھیں۔ اسلام کو عورتوں کے حقوق اور ان کے مساوی رتبہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ صرف آزاد عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی بلکہ باندیوں اور لونڈیوں کو بھی شرف و عزت کا مقام عطا کیا۔ چنانچہ بخاری (کتاب النکاح) کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے قبضہ میں کوئی لونڈی یا باندی ہو اور وہ اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے نیز اسے تہذیب و شائستگی اور فنون و آداب سے آراستہ کرے اور اس کے بعد اسے آزاد کر کے اس

سے نکاح کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

جہاں تک مردوں اور عورتوں کے روحانی ارتقاء اور اخلاقی نشوونما کا تعلق ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتادیا ہے کہ اس میدان میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کامل مساوات ہے اور مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنی جدوجہد کوشش اور اطاعت گزاری سے روحانی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

للرجال نصیب مما اکتسبو وللنساء نصیب مما اکتسبن۔

مرد جو کچھ (اپنی جدوجہد سے) حاصل کریں گے اور عورتیں جو کچھ (اپنی کوشش) سے حاصل کریں گی اس سے مستفید ہوں گی۔

یہ آیت معاشی اور روحانی زندگی دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ یعنی خواہ مال و دولت اور رزق کے حصول میں ہو یا روحانی اور اخلاقی ترقی کی دوڑ میں، ہر صنف کے لئے یکساں اور مساوی راہیں کھلی ہیں۔ مرد کی طرح عورت بھی معاشی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے کر مال و دولت کما سکتی ہے۔ یہی بات ایک اور جگہ اس طرح بیان کی گئی ہے۔

ومن یعمل من الصلحت من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیراً۔

جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو بھی، جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

مذہبی فرائض اور اخلاقی حدود کے دائرہ میں قرآن نے مردوں اور عورتوں کے درمیان میں کوئی فرق دامتیاز نہیں کیا۔ حقوق اللہ اور حق العباد

دونوں یکساں اور مساوی طور سے شریک ہیں۔ اس لئے خدا کی نگاہ میں ان کا درجہ اور مقام بالکل مساوی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و یقیمون الصلٰوۃ و یوتون الزکوٰۃ و یطیعون اللہ و رسولہ اولئک سیرحمھم اللہ۔ ان اللہ عزیز حکیم۔ وعد اللہ المومنین و المومنات جنت من تحتھا الانھار خالدین فیھا و مسکن طیبۃ فی جنت عدن و رضوان من اللہ اکبر۔ ذالک ھو الفوز العظیم

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ نمازیں قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، ان پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انھیں میں رہیں گے۔ اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے ارشاد کی رو سے مردوں اور عورتوں پر نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی، حق و صداقت کی تبلیغ اور باطل کی روک تھام یکساں طور سے فرض کی گئی ہے تو انھیں تعلیم کے دائرہ میں بھی یکساں حقوق اور مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ کیونکہ سچائی کی تبلیغ اور برائیوں سے روکنے کا کام صرف گھریلو زندگی کی چہار دیواری سے متعلق نہیں۔ قرآن نے ایسی کوئی تحدید نہیں کی جس سے یہ ثابت ہو کہ معاشی امور، سیاسی معاملات اور تعلیمی مسائل میں

عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ حکومت یا معاشرہ کی صحیح رہنمائی کریں اور
غلط تدابیر اختیار کرنے سے روکیں۔ پھر اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کا دائرہ سیاسی زندگی۔ معاشی امور اور تعلیمی مسائل پر بھی حاوی ہے تو وہ
عورتیں جنھیں تعلیم و تربیت کے مواقع سے محروم کرکے ملکی سیاسیات۔ تمدنی مسائل،
تعلیمی مشاغل یا معاشی اور صنعتی امور سے بالکل الگ کر دیا گیا ہو۔ معاشرہ
اور حکومت کو بُری راہوں پر چلنے سے کیسے روک سکتی ہیں۔ جو عورتیں سیاسی فہم
سے عاری ہوں، جنھیں یہ خبر نہ ہو کہ ان کا معاشی نظام کن بنیادوں پر قائم ہے،
جنھیں تعلیمی مسائل کی نوعیت اور پیچیدگیوں کا کوئی اندازہ نہ ہو، وہ ان امور
میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہیں
اس لئے قرآن کی مندرجہ بالا آیت سے لازمی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورتیں
اور مرد نہ صرف خانگی زندگی میں یکساں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں بلکہ سیاسیات۔
معاشیات اور تعلیم کے دائرہ میں بھی انھیں مساوی درجہ حاصل ہے۔ اور
اگر عورتیں اپنے ان خصوصی فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہ کریں جو خانگی
زندگی کے دائرے میں ان کے تفویض ہیں تو ان کے لئے عام ملکی اور سیاسی زندگی میں
حصہ لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار پاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف جنسی مساوات کا وہ تصور پیش کیا
جس میں عورتوں کو یکساں اور مساوی تعلیمی مواقع حاصل ہو سکتے ہیں، بلکہ اس
اس تصور کو عملی زندگی میں بھی برت کر بتایا۔ بے شمار احادیث و روایات سے
ثابت ہے کہ عورتیں کثرت سے حضورؐ کی خدمت میں آ کر گھریلو، سیاسی اور معاشی امور
کے بارے میں آپ سے سوالات کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی
خندہ پیشانی سے ایسے تمام سوالات کے جوابات دیتے اور روزمرہ کے مسائل زندگی

میں ان کی رہنمائی فرماتے۔ اس زمانے میں دُنیا کی عام حالت اور بالخصوص سر زمینِ عرب کی کیفیت ایسی تھی کہ نہ صرف عورتوں کے لئے باقاعدہ تعلیم گاہوں کا وجود نہ تھا، بلکہ لڑکوں کے لئے باقاعدہ تعلیم گاہوں کا وجود نہ تھا، بلکہ لڑکوں کے لئے بھی بڑے پیمانہ پر درس و تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے تعلیم نسواں کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی عورتوں کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کرتے تھے جو مذہبی اعتقادی، قانونی اور سیاسی مسائل کی واقفیت حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ جب اس نقطہ سے آنحضرت کی زندگی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام مسلمان عورتوں کو عام اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہیں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان مسائل پر گفتگو کریں۔ آپ نے عورتوں کے جذبہ تحقیق اور شوق جستجو کو صرف گوارا ہی نہیں کیا بلکہ ایجاباً ان کی حوصلہ افزائی کی۔ خود آپ کی شریک حیات حضرت عائشہؓ اپنے وقت کی بہترین عالم خیال کی جاتی تھیں اور خلفائے راشدین کے سیاسی اور ابتدائی دور میں صرف مذہبی امور میں نہیں بلکہ سیاسی معاملات میں بھی ان کی رائے اور مشورہ کو بڑا وزن حاصل تھا۔ بالخصوص فقہی مسائل میں حضرت عائشہؓ کے اجتہادات آج تک مسلّم ہیں۔

حضرت عائشہؓ عورتوں کے شوقِ علم اور ذوقِ تفحص کو کس نظر سے دیکھتی تھیں اس کا اندازہ مسلم کی ایک روایت سے کیا جا سکتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے ۔۔۔ انصاری عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"یہ عورتیں کتنی اچھی ہیں کہ وہ علم کی جستجو میں شرم وحیا کو بھی حائل نہیں ہونے دیتیں" (مسلم۔ کتاب الطہارت)

حضرت عائشہ کے اس بیان کی وجہ یہ ہوئی کہ بالعموم انصاری عورتیں دینی سیاسی

اور معاشرتی امور کے بارے میں آنحضرت سے بمقابلہ دیگر مسلمان عورتوں کے زیادہ سوالات کرتی تھیں۔ اس روش پر اعتراض یا تنقید کرنے کے بجائے حضرت عائشہؓ نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ تعریفی کلمات کہے۔

روحانی ترقی اور اخلاقی نشو ونما کے دائرہ میں عورتوں کے مساوی مرتبہ پر زور دیتے ہوئے قرآن حکیم نے کئی نامور اور مشہور خواتین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنی جدوجہد اور سعی و کوشش سے اعلیٰ اخلاقی فضائل پیدا کئے۔ چنانچہ قرآن ارشاد فرماتا ہے:

وضرب اللہ مثلاً للذین آمنوا امرأة فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنة ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظلمین ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمت ربها وکتبه وکانت من القانتین۔
(التحریم)

اور اللہ ان کے لئے جو ایمان لائے۔ فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے کہا اے میرے رب میرے لئے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے اور مریم عمران کی بیٹی جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا تو ہم نے اپنی روح اس میں پھونکی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھی۔

اس کے علاوہ قرآن نے چند ایسی عورتوں کا بھی خاص طور پر ذکر کیا جنھیں ان کے کمالات روحانی اور اخلاقی فضائل کے باعث اللہ نے اپنی خاص

...توں اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ مثلاً حضرت موسٰیؑ کی والدہ کے متعلق قرآن میں ہے:

واوحی الی ام ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی انا رادوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین۔ (القصص)

اور موسٰی کی ماں کی طرف ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا۔ پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور اسے رسولوں میں سے بنائیں گے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

واذ قالت الملئکۃ یمریم ان اللہ اصطفاک وطہرک واصطفٰک علی نساء العالمین۔ (آل عمران)

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے، اور دنیا کی تمام عورتوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔

اگرچہ قرآن حکیم عورتوں اور مردوں کی بنیادی مساوات کو تسلیم کرتا ہے اور تمام اہم امور میں انھیں یکساں حقوق عطا کرتا ہے لیکن اس کا تصور مساوات اس نظریہ پر مبنی نہیں جس کے تحت عورتوں اور مردوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور جس کا دعویٰ یہ ہے کہ فطرت نے دونوں صنفوں میں جداگانہ صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کرنے کے بجائے انھیں یکساں قابلیتوں اور مماثل قوتوں سے سرفراز کیا ہے۔ قرآن اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنے مخصوص اور

جُداگانہ معاشرتی فرائض رکھتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے انھیں بعض امور میں ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور تمدن کی ترقی کے لئے ہر صنف کو بعض خصوصی ذمہ داریاں سپرد کی ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے بعض کام ایسے ہیں جنھیں عورتیں زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیتی ہیں اور بعض کام عورتوں کی بہ نسبت مرد زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ جن صفات کی مردوں میں کمی ہے ان میں عورتوں کو قدرت نے کچھ زیادہ حصہ دیا ہے اور جن صفات سے عورتیں محروم ہیں ان کی کمی مرد پوری کرتے ہیں جنسی اختلافات کی اس افادیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

هو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منها زوجها لیسکن الیها (مائدہ)

وہ ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ وہ اس سے راحت حاصل کرے۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ (الروم)

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمھارے لئے تمھارے نفسوں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمھارے درمیان محبت اور رحم قائم کیا۔

الرجال قوامون علی النسا بما فضل اللہ بعضهم علی

مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں

بعض وبما انفقوا من اموالهم (سورہ النساء)	سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں میں سے خرچ کیا ہے ۔
ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجہ ۔	اور ان کے لیے پسندیدہ طور پر حقوق ہیں جیسے ان پر حقوق ہیں، اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے ۔

ان آیات میں عورتوں اور مردوں کے وظائف اور ان کے مرتبے کے متعلق قرآن حکیم نے کچھ ارشادات کئے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مردوں اور عورتوں کی مساوی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے ان کے فروق واختلافات کو بھی مدنظر رکھتا ہے ۔ مثلاً قرآن پہلی آیت میں بتاتا ہے کہ عورت کو مرد کے لئے تسکین کا باعث اور طمانیت کا موجب ہونا چاہیئے ۔ اب اگر کوئی عورت یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس طمانیت اور تسکین کے اسباب مہیا کرنے پر مجبور نہیں، بلکہ اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے مردوں کے ساتھ تفریح کرتی پھرے ۔ کیونکہ آزادیٔ نسواں اور اصول مساوات کے معنی یہی ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ دعویٰ قرآن کے نظریۂ مساوات کے منافی ہے، بعد کی آیات میں قرآن کہتا ہے کہ بعض امور میں عورتیں مردوں پر افضل ہیں اور بعض میں مرد عورتوں پر فضیلت رکھتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی مرد ایک درجہ افضل ہے ۔ جس کے معنی یہ نہیں کہ وہ عورتوں پر حاکم ہے اور عورتیں اس کی محکوم ہیں ۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ تمدنی امور اور معاشرتی معاملات میں مرد کی رائے کو عورتوں کی بہ نسبت

کچھ زیادہ وزن حاصل ہے۔" قوامون" کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مردوں کو حاکمیت کا درجہ حاصل ہے، بالکل غلط ہے۔ قوام کے معنی صرف یہ ہیں کہ معاشی اعتبار سے مرد اپنے خاندان کا کفیل ہے۔ اور اس لئے وہ خاندان کے نظم ونسق اور گھر کے انتظام میں بہ نسبت عورتوں کے کسی قدر زیادہ بااختیار رہے۔ قرآن نے اس سے زیادہ مرد کو اور کوئی فضیلت نہیں دی اور جو لوگ مرد کی مطلق حاکمیت کے قائل ہیں انھوں نے قرآن کے مطلب کو بالکل نہیں سمجھا۔ بعض لوگ مرد کی حاکمانہ حیثیت کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ لیکن یہ حدیث اسلام کی پوری اسپرٹ کے خلاف اور اسلامی مساوات کے بالکل منافی ہے۔ اس لئے ہر دیانت دار مسلمان جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام انسانی مساوات کے قیام کے لئے آیا تھا اور وہ انسانوں کو ایک دوسرے کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتا ہے اس حدیث کو مسترد کر دینے پر مجبور ہے۔

قرآن کی ان تصریحات سے بالواسطہ بعض نتائج مستنبط ہوتے ہیں جو معاشرتی زندگی کی فلاح و صلاح کے لئے بیحد اہمیت رکھتے ہیں یعلوم ہوتا ہے کہ قرآن پہلے مساوات جنسی کا ایک عام نظریہ پیش کرتا ہے اور اس کے بعد اس نظریہ کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ یہ مساوات بے رنگی اور بے تنوعی کی مساوات نہیں، بلکہ اس میں عورتوں اور مردوں کی جداگانہ خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لئے چند خصوصی حقوق و فرائض معین کئے گئے ہیں جو مشترکہ حقوق و فرائض کے علاوہ ہیں یعنی بعض حقوق و فرائض میں مرد اور

عورتیں یکساں شریک ہیں اور بعض حقوق و فرائض ایسے ہیں جو ایک صنف کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن بنیادی حیثیت سے مردوں اور عورتوں کے مابین کامل مساوات کا رشتہ ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قرآن نے عورتوں کو مردوں کے لیے وجہ تسکین قرار دے کر ان کے درمیان محبت اور مودت کے رشتہ کو ایک فطری رشتہ کی حیثیت دی تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ بیوی اور شوہر کے تعلقات مستقل بنیادوں پر استوار ہونے چاہئیں۔ محض عارضی دلچسپیاں اور وقتی جذبات کے تحت ان کا اجتماع دیرپا نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر مرد و عورت دونوں کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ان کا مستقبل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی تشکیل کے لیے ان کے درمیان مودت و رحمت کا تعلق ہونا چاہیئے۔ لیکن مستقبل کے لیے اشتراکِ عمل کا جذبہ صرف اولاد اور خاندان کے واسطے سے پیدا ہو سکتا جن عورتوں اور مردوں پر اولاد کی پرورش اور نگرانی کی کوئی ذمہ داری نہ ہو وہ وقتی جذبات کے تحت تو کچھ عرصہ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں لیکن باہمی معاونت کا کوئی دیرپا جذبہ ان کے اندر کبھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ مذاق و طبیعت کی یکسانیت یا فنی اور علمی رجحانات کا اشتراک بھی مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی گہرا رابطہ نہیں قائم کر سکتا۔ کیونکہ شاذ و نادر ہی عورتوں میں علم و فن کا ذوق اتنی شدت اختیار کرتا ہے کہ وہ ایک مستقل رشتہ مودت بن سکے۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ محض ہم مذاقی یا ہم پیشگی کی بنا پر کسی مرد نے کسی عورت کے ساتھ عرصہ دراز تک زندگی بسر کی ہو۔ البتہ اولاد کی خواہش، جنسی میلانات کی کشش اور مذاق طبیعت کی یکسانیت، یہ سب عناصر مل جلکر مردوں اور عورتوں

کے درمیان ایک مضبوط اور مستقل اتحاد پیدا کر سکتے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ سب عناصر میں اولاد کی خواہش اور پرورش سب سے زیادہ طاقتور اور موثر ہے۔ اگر اس عنصر کو خارج کر دیا جائے تو بقیہ دو یعنی اتحاد مذاق اور جنسی کشش دیرپا رابطہ الفت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ اس لئے اسلام نے جنسی مساوات کا جو تصور پیش کیا ہے، خاندانی زندگی اور اولاد کی پرورش و نگرانی اس کے لازمی اجزاء ہیں۔ لیکن خاندانی زندگی اور اولاد کی پرورش میں مردوں اور عورتوں پر مشترکہ ذمہ داریوں کے علاوہ کچھ خصوصی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ پھر ان خصوصی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہر صنف کو کچھ خصوصی حقوق ملتے ہیں اور ان خصوصی حقوق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض امور میں عورتوں کے حقوق مرجح اور بعض میں مردوں کے حقوق بالاتر ہو جاتے ہیں اور کامل جنسی مساوات کا نظریہ بنیادی اعتبار سے صحیح ہونے کے باوجود عملی تفصیلات میں متاثر ہو جاتا ہے۔

انہی وجوہ سے قرآن نے مردوں کو عورتوں کے بالمقابل ایک درجہ فضیلت دی ہے اور انہیں عورتوں کا قوام کہا ہے۔ کیونکہ مرد کی خصوصی ذمہ داریاں عورت سے زیادہ ہیں۔ اس کو خاندان کی معاشی کفالت کے علاوہ جس کے لئے اسے اپنی توانائیوں اور وقت و فرصت کا بیشتر حصہ صرف کرنا پڑتا ہے اولاد کی تعلیم و تربیت اور نگرانی بھی کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ عورتیں معاشی کفالت کے فریضہ سے آزاد ہیں اس لئے ان کے حقوق بھی مرد کی بہ نسبت کم ہیں۔ لیکن مرد کی قوامیت سے اس کی فطری فضیلت ثابت نہیں ہوتی اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ محض قوام ہونے کی بنا پر مرد افضل اور عورت کم رتبہ ہے۔ کیونکہ مرد کو قوامیت کا درجہ محض معاشی زندگی کے مصالح اور انتظامات کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اگر عورت کو بعض فطری مجبوریاں لاحق نہ ہوتیں اور اولاد کی پیدائش

اور پرورش میں اسے اتنا زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑتا تو وہ بھی معاشی زندگی میں مرد کے برابر حصہ لے سکتی ہے اور مرکی قوامیت وجود میں نہ آتی۔ فطرت نے دراصل تقسیم کار کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی معاشی کفالت مرد کے ذمہ اور اولاد کی پیدائش و تربیت عورت کے سپرد کر دی ہے۔ اس تقسیم کار سے جنسی مساوات کا بنیادی نظریہ متاثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس طرح ایک دفتر یا کارخانے کے انتظام میں بعض اشخاص اور ملازمین کو بلحاظ قابلیت اور صلاحیت کچھ زیادہ حقوق و مراعات دے دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح مرد کو بھی اس کی معاشی جدوجہد کی قابلیت کی بنا پر فطرت نے کچھ اونچا رتبہ دے دیا ہے۔ لیکن جس طرح کارخانوں یا دفتروں میں اونچے سے اونچے درجہ کے افسر بھی بہر حال ملازم ہوتے ہیں اور جہاں تک ملازمت کی حیثیت کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس طرح عورت مرد سے کچھ کم درجہ رکھنے کے باوجود انسانی حیثیت میں مرد کے مساوی ہے۔ یعنی وہ بھی کچھ مستقل حقوق و اختیارات میں مداخلت کرے یا اسے اپنا محکوم سمجھ کر اس کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کا سا برتاؤ کرے۔

قرآن نے جنسی مساوات کا جو تصور پیش کیا تھا اور اس کی تصدیق مغربی حکما اور نفسیات دانوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے زمانۂ حال میں مردوں اور عورتوں کے عضویاتی اختلافات کی نسبت بڑی گہری تحقیقات کی ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف الکزس کیرل جس کو نوبل پرائز ملا تھا، اپنی کتاب MAN THE UNKNOWN میں لکھتا ہے:۔

"مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے ہیں۔ یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت

کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عورتوں کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادّے خارج ہوتے ہیں۔ ان کا اثر صنفِ نازک کے ہر حصہ پر پڑتا ہے مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے۔ ان بنیادی حقائق کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے نسوانی آزادی کے علمبرداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں حالانکہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے ہر خلیہ پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ یہی بات اس کے اعضا کے متعلق بھی صحیح ہے اور بالخصوص اس کے نظامِ عصبی سے متعلق۔ عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں۔ تہذیب کے ارتقا میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے انھیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلوتہی نہیں کرنی چاہیئے۔"

ہیولاک ایلیس جو اس زمانہ میں جنسی نفسیات کا سب سے بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے اپنی کتاب "مرد اور عورت" میں عورتوں کی خصوصی فطرت اور جداگانہ خواص وصفات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورتوں کی طبیعت میں بہ نسبت مردوں کے تاثر اور انفعالیت کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی عورتیں دوسروں کے بیانات اور خیالات کو بہ نسبت مردوں کے جلد قبول کر لیتی ہیں۔ بڑے بڑے امور کی بابت یہی مصنف لکھتا ہے:

"عورت ہر اس خیال اور رائے کے لئے جان تک دینے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے جسے مدعیانہ اور موثر انداز میں اس کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس کی جذباتی فطرت کو

متحرک کردے ۔"

اس کے علاوہ ایلس کہتا ہے کہ عورت دوسروں کی ہمدردی کے لئے تڑپتی ہے اور اس میں خود مختاری کا جذبہ ویسا پُر زور نہیں ہوتا جیسا مردوں میں ہوتا ہے ۔ اس دعوے کے ثبوت میں ایلس ان چند عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے جنھوں نے بڑے بڑے عملی کام کئے ہیں ۔ ان میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جس نے اپنا بہترین کام مردوں سے الگ رہ کر انجام دیا ہو۔ چنانچہ میڈیم کیوری نے اپنے شوہر کیوری کے ساتھ سائنس میں ۔ مسز براؤننگ نے اپنے رفیق حیات براؤننگ کے ساتھ شاعری میں ۔ اور جارج ایلیٹ نے مسٹر لیوس کے ناول نویسی کے میدان میں جو کارہائے نمایاں کئے وہ مردوں کی معیت اور رفاقت کی وجہ سے معرض وجود میں آئے ۔

بحیثیت مجموعی ہیولاک ایلس کا خیال ہے کہ عورتوں کی عملی صفات اس طرز اور نوعیت کی نہیں جیسے مردوں کی ہیں ۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ مرد عورتوں سے بہ اعتبار عقل و فہم برتر ہیں ۔ بلکہ دونوں کے عقول کی نوعیت میں فرق ہے ۔ مردوں میں جس قسم کی عقلی صفات کم پائی جاتی ہیں، وہ عورتوں میں زیادہ ملتی ہیں ۔ عورتوں میں جس عقل کی کمی ہے، اس میں مرد بڑھے ہوئے ہیں، مثلاً مردوں میں اپنے حاصل کردہ علم سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے ۔ وہ جو کچھ سیکھتے یا حاصل کرتے ہیں اس میں مزید غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کے ذریعہ اضافہ کرتے رہتے ہیں ۔ نیز وہ اپنے شعبۂ علم و فن کی تفصیلات و جزویات پر زیادہ حاوی ہوتے ہیں ۔ انھیں سائنس کے مشاغل اور تجربات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ ان کی قوت مشاہدہ بھی عورتوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس عورتوں کو تحلیل و تجزیہ کا عمل بالطبع ناپسند ہوتا ہے ۔ کیونکہ انھیں جبلتہً یہ محسوس

ہوجاتا ہے کہ تحلیل و تجزیہ کے عمل سے ان کی جذباتی ساخت کو صدمہ پہونچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو بے لچک قواعد اور اٹل اصولوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی جذبات و ہیجانات سے مرکب ہوتی ہے۔

پھر ایلیس کہتا ہے کہ عورتوں کی یہ صفات عقل کی کمی پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ جنسی اختلافات کا نتیجہ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کے لئے عورتوں کا دماغ ناموزوں ہے۔ خواہ مستثنیٰ صورتوں نے اس دائرہ میں کتنا ہی اچھا کام کر دکھایا ہو۔

یہ رائے صرف ہیویلاک ایلیس کی نہیں، بلکہ اور بہت سے نفسیات دانوں اور ماہرین جنسیات بھی عورتوں کی فطرت کے متعلق اسی خیال کے حامی ہیں، اپنی کتاب "عورتوں کی جنسی زندگی" میں کش لکھتا ہے کہ لڑکیوں میں بلوغ کے وقت جسمانی تبدیلیوں کے علاوہ ذہنی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ونگ جو ناروے کا ایک طبیب تھا کہتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے فروق و اختلافات ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے ہیں اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ اختلافات صرف ان کے چند جسمانی اعضا تک محدود ہیں۔

ڈاکٹر ٹیمبر دس گنا اپنی کتاب "روح نسوانیت" میں تحریر کرتی ہے کہ "عورتیں اور مرد صرف طول و قامت ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں کرتے۔ ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ان کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ کہتی ہے "ترقی اور ارتقاء صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے معاشرتی حقوق و فرائض کا تعین کرنے میں ان کے فروق و اختلافات کو مد نظر رکھا جائے۔"

ان تمام تحریروں اور بیانات سے قرآن کے نظریہ مساوات جنسی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ قرآن نے ایک طرف تو مرد اور عورت کو مساوی درجہ دیا اور انسانی حیثیت میں ان کے مابین کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ دوسری طرف ان کے حقوق و فرائض اس طرح معین کئے کہ چند دائروں میں دونوں صنفوں کے حقوق و فرائض مشترک اور مساوی ہیں اور بعض دوسرے دائروں میں فطری اختلافات کے لحاظ سے ان کے حقوق و فرائض مختلف رکھے گئے ہیں۔ اس طرح عورتیں ایک لحاظ سے مردوں کے بالکل مساوی ہیں اور ایک معنی کر کے مرد کو قدرے افضل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس فضیلت سے نہ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں بالکل بے حق اور بے اختیار ہیں اور نہ اسے یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ فطرت نے اپنی بخشائشوں میں عورتوں کے ساتھ بخل سے کام لیا ہے کیونکہ تمدنی زندگی میں تقسیم کار کے اصول پر بعض حقوق و فرائض مرد کے اور بعض عورت کے تفویض کئے گئے ہیں جس سے مرد کو کسی قدر برتری حاصل ہوگئی ہے۔

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر ویسٹر مارک اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ منا کحت کا فعل تین اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے۔ اول جنسی جذبات کی تکمیل۔ دوم ان جذبات سے قطع نظر کرکے مرد اور عورت کا دوستانہ تعلق۔ سوئم اولاد کی خواہش۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام رشتۂ ازدواج کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور رسمِ ازدواج کی قدر کو اہمیت دیتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عیسائیت کے برعکس، جس کے شارحین اور مفسرین نے شادی اور نکاح کو ایک ناگزیر برائی قرار دیا ہے اسلام اسے ایک مقدس فریضہ کی حیثیت دیتا ہے اور ہر مرد و عورت پر یہ لزوم عائد کرتا ہے کہ بجز اس صورت کے جب کہ کوئی معاشی یا جسمانی مجبوری لاحق ہو، وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

علیکم بالباءۃ فانہ اغض للبصر و احصن للفرج فمن لم یستطع منکم فعلیہ بالصوم وان الصوم لہ وجاء۔	تم تندرست لوگوں کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ وہ آنکھوں کو بدنظری سے بچانے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور جو شخص تم میں سے نکاح کرنے کی
طاقت نہ رکھتا ہو اُس کو روزے
رکھنے چاہئیں ۔ کیونکہ روزہ شہوت
روکنے کا ذریعہ ہے ۔

اسی طرح حضرت ابوایوب سے روایت ہے کہ :

عن ابی ایوب قال قال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم اربع من سنن
المرسلین الحیاء والعطر
والسواک والنکاح ۔

حضرت ابوایوب کا بیان ہے کہ
حضور نے فرمایا چار چیزیں تمام انبیا
کی سنت ہیں :
حیاؔ ، خوشبوؔ ، مسواکؔ اور
نکاحؔ ۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ جس شخص نے نکاح
کیا اس نے اپنا نصف دین مکمل کر لیا ۔ باقی نصف دین کے بارے میں
اُسے اپنے خدا سے ڈرتے رہنا چاہیئے ۔ قرآن حکیم نے بھی مسلمانوں کو ازدواجی
زندگی بسر کرنے کی ترغیب و تلقین کی ہے ۔ لیکن اس شد و مد کے ساتھ نہیں ۔
چنانچہ قرآن فرماتا ہے :۔

وانکحوا ما طاب لکم
من النساء

اور نکاح کرو ان عورتوں سے
جو تمھیں پسند آئیں

واحل لکم ما وراء
ذالکم ان تبتغوا باموالکم
محصنین غیر مسافحین ۔

اور جو اس کے سوا ہیں ، وہ
تمھارے لئے حلال ہیں اس طرح کہ
تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کو تلاش
کرو نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی

کرتے ہوئے۔

ومن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنت المومنت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیتکم المومنات

جو شخص تم میں سے اتنی فراخی کی طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمھاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرے، جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔

الیوم احل لکم الطیبت و طعام الذین اوتوا الکتب حل لکم و طعامکم حل لھم والمحصنت من المومنت والمحصنت من الذین اوتوا الکتب من قبلکم اذا آتیتمو ھن اجورھن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔

اور ان میں سے پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی۔ جب تم ان کو مہر دے دو نکاح میں لانے والے نہ کھلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے۔

ان آیات میں قرآن حکیم نے پاکدامن مردوں کے لئے محصنین اور پاک دامن عورتوں کے لئے محصنات کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مادہ حصن ہے یہ لفظ عربی زبان میں قلعہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے چونکہ قلعہ فوج کی حفاظت کا کام دیتا ہے اس لئے قرآن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ نکاح بھی انسان کی پاکدامنی اور عفت کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے۔

اوپر کی آیات و احادیث سے جو نتیجہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے ازدواجی زندگی کی قید مردوں اور عورتوں کے لئے اس وجہ سے لگائی

ہے تاکہ وہ عفت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کر سکیں اور ان کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات نہ قائم ہوں۔ کیونکہ ایسے تعلقات مخفی اور رازدارانہ ہوتے ہیں اور ان سے طرح طرح کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نکاح کی رسم میں ان دونوں اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے یعنی ایک تو عفت و پاکدامنی کا تحفظ۔ دوسرے خفیہ جنسی تعلقات کا انسداد۔ عورتوں کے فطری اور اصلی حقوق انھیں دونوں اقدار سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمانۂ حال میں عفت اور پاکدامنی کے تصور پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ صفات معاشرتی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اور جنسی تعلقات کے پھیلاؤ سے ازدواجی زندگی کی مسرتوں یا اولاد کی تربیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا بلکہ بعض مکاتیب خیال نے یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ خاندانی زندگی بھی انسانی معاشرہ کی صحت و تومندی کے لیے ضروری نہیں۔ توالد و تناسل کا سلسلہ نکاح اور ازدواج کو ترک کر کے بھی جاری رکھا جا سکتا ہے اور تربیت اولاد کے لئے گھر کے سوا دوسری متبادل صورتیں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ عفت و پاکدامنی کے اقدار کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم خاندانی زندگی کی ضرورت سے بحث کریں اور ان متبادل تجاویز پر غور کریں جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے بعد خاندانی نظام بے ضرورت ہو جائے گا۔

دائرۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات خواہ مردوں کے ہوں خواہ عورتوں کے اسلام کی نظر میں یکساں قابل ملامت اور قابل سرزنش ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی اور زنا کو بہر حال ایک بدترین جرم قرار دیا ہے خواہ اس کا ارتکاب مرد کی طرف سے عمل میں

آئے یا عورت کی طرف سے۔ اس یکسانیت اور اصولِ مساوات کی تعلیم کے باوجود خود مسلمانوں کی سوسائٹی اور دیگر معاشروں میں جن میں یورپین معاشرہ بھی شامل ہے عورتوں کی جنسی آوارگی کو بہت زیادہ قابلِ ملامت قرار دیا جاتا ہے اور مرد اگر فعلِ زنا کا ارتکاب کرے تو اسے اتنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی بدچلنی کے خراب اثرات زیادہ شدید اور دور رس ہوتے ہیں۔ عورت اگر فعلِ زنا کا ارتکاب کرے تو اس سے خاندانی نظم کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ مردوں کی بدچلنی سے گھریلو زندگی میں خرابیاں تو ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن اکثر صورتوں میں یہ خرابیاں اتنی شدید نہیں ہوتیں کہ ان سے نظمِ معاشرت کے پارہ پارہ ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ عورتوں اور مردوں کے مابین اس عدم مساوات پر بحث کرتے ہوئے ویسٹر مارک کہتا ہے :-

"عورت اور مرد کے درمیان اس مسئلہ میں جس عدم مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے اس کی بعض خصوصی وجوہات ہیں۔ رومی قانون دانوں کا یہ ایک مسلمہ اصول تھا کہ زنا صرف شادی شدہ عورت کے لئے جرم ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مرد کو غیروں کی اولاد کا ذمہ دار بننا پڑتا ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ مانع حمل طریقوں کے رواج کے باعث عورتوں کی جنسی آوارگی سے نسب میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے کہ جذباتِ عشق سے وارفتہ ہونے کے بعد فریقین مانع حمل تدابیر کا خیال نہیں کرتے۔ نان کرافٹ ایبنگ کا خیال ہے کہ عورت کی بیوفائی بمقابلہ مرد کے اخلاقی اعتبار سے زیادہ قابلِ سرزنش ہے اور اسے اس جرم کے لئے قانون کے تحت سخت تر سزا ملنی چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ بے وفا عورت صرف اپنی شخصی عزت ہی پر حرف نہیں لاتی، بلکہ

شوہر اور اہل خاندان پر بھی۔

کش کہتا ہے کہ مرد کی جنسی لغزشوں کے نتائج اتنے خطرناک نہیں ہوتے۔ وہ کسی وقت بھی اپنے افعال سے توبہ کر کے تلافی مافات کر سکتا ہے۔ لیکن عورت کی بے وفائی اس کی روح کو ہمیشہ کے لئے گندہ کر دیتی ہے اس سے ماں بچوں کے تعلقات کی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کا نسب بھی مشتبہ ہو جاتا ہے اور گھریلو زندگی کی فضا مسموم ہو جاتی ہے۔

ہیڈوگ دیکا کہتا ہے کہ شوہر کی زناکاری ایک خالص جنسی عمل ہے جس سے رشتۂ نکاح پر لازماً کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ لیکن بیوی کا یہ فعل محض جسمانی لذت کے شوق پر مبنی نہیں ہوتا۔

اسٹنڈہال کہتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی جنسی بدعنوانیوں کا فرق اتنا حقیقی ہے کہ ایک فراخ دل عورت اپنے شوہر کی بدچلنی کو معاف بھی کر سکتی ہے لیکن مرد کے لئے یہ چیز ناممکن ہے۔"

ان مصنفین کی آراء درج کرنے کے بعد ویسٹر مارک کہتا ہے کہ:۔

"غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کے لئے جنسی آوارگی اور اعتبار سے مفید ہو تو ہو لیکن اس کے بعض نتائج نہایت ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ زناکاری سے امراض خبیثہ پیدا ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زانیہ عورت کی زندگی کے لئے بسا اوقات اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ نسب کی خرابی سے ناجائز اولاد کی شرح اموات جائز اولاد سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی اولاد آگے چل کر اکثر جرائم پیشہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس کو بچپن میں ناسازگار حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ مغربی ممالک میں ناجائز بچوں

کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ ساری تہذیب کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے۔ یہ بات یقیناً بعید از عقل ہے کہ کسی شہری کے قانونی حقوق متعین کرتے وقت اسکے ماں باپ کے افعال و عادات کو مدنظر رکھا جائے۔ لیکن قانون میں کتنی ہی اصلاحات عمل میں آئیں اور ناجائز اولاد کی بہتری اور بہبود کے لئے اس میں کتنی ہی تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسے بچوں کے لئے وہ ساز گار حالات مہیا کئے جا سکیں جن میں دوسرے بچے پلتے اور بڑھتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے بچوں کی ماؤں کے لئے اسٹیٹ گزارے مقرر کرے جب کہ ان کے باپ کا پتہ نہ چل سکے یا وہ معاشی حیثیت سے ان کی کفالت نہ کر سکتے ہوں۔ نیز ان کے لئے تربیت گاہیں اور مدارس بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بے گھر ہو جانے اور شفقت محبت سے محروم رہنے کی وجہ سے جو خرابیاں واقع ہوتی ہیں ان کی تلافی کرنی ناممکن ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مانع حمل تدابیر اختیار کرنے سے یہ تمام برائیاں ختم کی جا سکتی ہیں، چنانچہ ڈاکٹر ایلس کا بھی یہی خیال ہے کہ انگلستان کے مقابلے میں جرمنی میں ناجائز بچوں کی پیدائش کی کمی کا سبب یہ ہے کہ وہاں مانع حمل تدابیر زیادہ وسیع پیمانہ پر رائج ہیں۔ لیکن جب ہم سنتے ہیں کہ ایسے بچوں کی تعداد جرمنی میں تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے تو ہمارا یقین متزلزل ہو جاتا ہے کہ قید نکاح سے باہر توالد و تناسل کا سلسلہ آئندہ چل کر ختم ہو جائے گا۔ لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو غیر شادی شدہ ماں کو محض اس بنا پر قابل ملامت نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے اولاد کیوں ہوئی، بلکہ یہ واقعہ (یعنی اولاد کی پیدائش) ایک ایسے فعل کا حتمی ثبوت اور ٹھوس شہادت ہے جس کو فی نفسہٖ لائق نفرت خیال کیا جاتا ہے۔"

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی جنسی بدعنوانیوں کو صرف مذہبی اعتقادات کی بنا پر یا بغیر کسی معقول وجہ کے لائق ملامت خیال نہیں

کیا جاتا، بلکہ ان سے ازدواجی زندگی کی مسرتیں۔ خاندانی روابط اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ازدواجی بے وفائی سے رشک و حسد کے جذبات بھی بھڑک اٹھتے ہیں جو فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے انتہائی خطرناک اور مہلک ہیں۔ بعض مکاتیب خیال کی رائے یہ ہے کہ رشک و حسد کا جذبہ انسان کے دورِ وحشت کی باقیات میں سے ہے اور تعلیم و تہذیب کی ترقی سے اس کا وجود رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ ویسٹر مارک خود اس جذبہ کو دورِ قدیم کی ایک بے حقیقت یادگار قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ رشک و حسد کی بعض اقسام ایسے بھی ہیں جن کا انسان کی تمدنی پستی یا ترقی سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا رشک و حسد دو افراد کے باہمی تعلقات کی انوکھی نوعیت سے پیدا ہوتا ہے۔

آگے چل کر ویسٹر مارک لکھتا ہے:۔

"آدمی اور بالخصوص مہذب آدمی کا حسد حق تلفی کے احساس سے قطع نظر کر کے جانوروں کے جذبۂ حسد سے مختلف ہوتا ہے آدمی کے حسد میں اس کی محبت کا رنگ جھلکتا ہے اور اس میں ایک احساس ذلت کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ کیونکہ جب انسان کا محبوب اس کے قبضۂ اقتدار سے نکل جاتا ہے یا وہ اس کے حصول میں ناکام رہتا ہے تو وہ اپنی نظروں میں آپ ذلیل ہو جاتا ہے اور اپنے وقار میں کمی محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے شخص سے محض اس لئے حسد کرے کہ شخص مذکور نے اُسے کسی چیز سے محروم کر کے وہ چیز خود حاصل کر لی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اس امر کا خوف بھی شامل ہو سکتا ہے کہ ایک غیر شخص

کی اولاد اس کے عیال کی حیثیت حاصل کرے گی لیکن جنسی حسد کی تمام صورتوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے یعنی وہ غم و غصہ کی ایک لہر ہے جو اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک محبوب جو ہمارے جذباتِ جنسی کا مرکز و محور ہے ہمارے قبضہ سے باہر ہو گیا ہے یا ہم بلا شرکتِ غیرے اس کے مالک نہیں رہے ہیں یہ بالکل ناممکن ہے کہ اس قسم کا جذبہ کبھی دنیا سے بالکل مفقود ہو جائے خواہ وہ فی نفسہٖ کتنا ہی غیر ضروری ہو۔ اس کی شدت و وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انگلستان کے ایک مہتمم قید خانہ نے ۱۸۸ واقعات قتل کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ۴۶ واقعات محض جنسی حسد کی بنا پر عمل میں آئے لیکن جہاں شوہر یا بیوی کی بیوفائی سے جنسی رشک و حسد کی آگ مشتعل نہ ہو وہاں بھی اس عمل سے فریقِ ثانی کو سخت ترین قلبی صدمہ پہونچتا ہے اور میرا خیال ہے کہ بیوی اور شوہر اپنے شریکِ حیات سے جائز طور پر مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ انھیں اس قسم کے صدمات سے محفوظ رکھے۔

ہیلن اسٹوکر کی رائے ہے کہ محبت جیسے لطیف جذبہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ محبوب کو حتی الامکان رنج اور تکلیف سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ محبت فراخدلی اور عفو و رحم کے جذبات سے معمور ہوتی ہے۔ لیکن یہ کوئی فراخدلی یا رحیمانہ فعل نہیں ہے کہ محبوب کے عفو و ترحم سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے تکلیف پہنچائی جائے۔"

ہمارے ملک کے کمیونسٹ نما حضرات جو کمیونزم کے پردے میں دراصل اپنے سرمایہ دارانہ اور عشرت پسندانہ طرز زندگی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس غلط خیال کی اشاعت کر رہے ہیں کہ سوویٹ نظام میں عورتوں کی عفت و پاک دامنی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، کیونکہ اس قسم کے اقدار و تصورات مذہبی تعلیمات کے پیدا کردہ ہیں جن کی صداقت اب مشکوک ہو گئی ہے لیکن ہیو یلاک ایلس جیسا ماہر جنسیات اس بارے میں لکھتا ہے :-

"دنیا بھر میں اس وقت یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ بالشویک پارٹی کے افراد جنسی اعتدال اور عفت و پاکدامنی کے قائل نہیں ہیں۔ یہ تصور اس زمانہ میں پیدا ہوا جب روس کی جدید سوویٹ حکومت مستحکم نہیں ہوئی تھی اور اسے اچانک بڑے پیچیدہ اور انتشار آفریں حالات سے سابقہ پڑا۔ اس حالتِ انتشار سے خود لینن غمزدہ تھا۔ کیوں کہ لینن کا خیال تھا کہ جنسی بے اعتدالیاں اور خالص شہوانیت جس سے نسل انسانی کو فائدہ نہ پہونچے سوسائٹی کے لئے سخت مضرت رساں ہیں۔ سوویٹ معاشرہ اب لینن کے اسی نظریہ پر عامل ہے۔"

اسی مصنف کا بیان ہے سوویٹ معاشرہ میں بدچلن عورتوں کو بڑی۔۔۔ ناقدری کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو عورتیں ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی ہیں، ان کے لئے روس کی فضا بڑی سازگار ہے۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ملانسکی کا بیان ہے کہ آوارہ عورتوں کو سوویٹ روس

میں ایسے اشخاص بھی بے قدری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کیونکہ عمدتاً مرد اس قسم کی عورتوں کو زنانِ بازاری کا آسان بدل تصور کرتے ہیں اور انھیں اس سے زیادہ عزت دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک مرد پر قناعت کرنے والی عورت جو خاندانی زندگی اور مادری فرائض کے لئے سب سے زیادہ اہل اور موزوں ہے آسانی کے ساتھ اپنے موجودہ مرتبہ سے محروم نہیں کی جا سکتی۔"

آزادانہ جنسی تعیش کے دلدادہ حضرات اس طرزِ حیات کے حق میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان اپنی گردن پر خواہ مخواہ خاندانی زندگی کے افکار اور ذمہ داریوں کا بوجھ کیوں اُٹھائے رہے اور کیا وجہ ہے کہ وہ تا عمر ایک عورت کے دامن سے بندھا رہے۔ ایسے اشخاص کے نقطۂ نظر پر بحث کرتے ہوئے ہیولاک ایلس کہتا ہے:-

"بعض وقت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آئندہ نسلوں نے ہمارے لئے کیا کیا ہے، جو ہم خواہ مخواہ ان کے لئے قربانیاں کریں۔ یہ سوال عموماً غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جس چیز کو آئندہ نسل کہا جاتا ہے وہ دراصل انسانیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم آئندہ نسل کے بجائے انسانیت کا لفظ استعمال کر کے بھی سوال اُٹھائیں تو اس کا جواب آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ خدا اور فطرت نے ہماری تخلیق اور نشو و نما میں جو حصہ لیا ہے۔ اگر ہم اس کو نظر انداز کر دیں تو ہم اپنے سارے کمالات و صفات کے لئے انسانیت کے شرمندہ احسان ہیں۔

ہم جو کچھ بھی ہیں ہم نے علم، تہذیب، اخلاق اور دیگر اقدار حیات میں جو کچھ ترقی کی ہے، ان سب کے بانی مبانی ہمارے اسلاف ہیں جنھوں نے اپنی محنت۔ جد و جہد اور کوشش سے ہمارے لئے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی ایک بیش قیمت میراث چھوڑی ہے۔ اسلاف کے اس بار احسان سے ہم اس طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ہم ان صفات و کمالات کو ترقی یافتہ اور بہتر اشکال میں آئندہ نسلوں کے سپرد کر دیں۔"

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عورتوں اور مردوں پر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا لزوم کیوں عائد کیا ہے۔ ازدواجی زندگی اور اولاد کی تعلیم و تربیت کے بغیر انسانی شخصیت کا نشو و نما نہیں ہو سکتا اور تہذیب و تمدن نیز اخلاق و مذہب کی روایات کو ایک نسل سے دوسری نسل پر منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بچوں کا وجود اور ان کی دیکھ بھال والدین کی شخصیت کے ارتقاء کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنا خود ماں باپ کا وجود بچوں کی نشو و نما کے لئے۔ اس کے علاوہ ایک قابل لحاظ امر یہ بھی ہے کہ اگر انسان کی انفرادیت اور اس کی غیر مشترک خصوصیات جو اس کے اندر شان یکتائی پیدا کرتی ہیں۔ سوسائٹی کی بقاء و ترقی کے لئے ضروری ہیں تو ہر رکن معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ انفرادی خصوصیت کو دوسری نسلوں میں منتقل کر کے ان خصوصیات کا دائرہ وسیع کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادیت کی ثروت کو ترقی دینے اور پھیلانے کا کام صرف اس طرح عمل میں آ سکتا ہے کہ کسی فرد معاشرہ کو بلا وجہ معقول تجرد کی زندگی گزارنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خاندانی زندگی کی بقاء و استحکام کے لئے

عفت و پاکدامنی کے اقدار ضروری ہیں تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا خاندان کے علاوہ بقائے نسل انسانی اور اولاد کی تعلیم و تربیت کی دوسری متبادل صورتیں ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر خاندانی نظام کی جگہ ان فرائض کی بجا آوری کے لئے اور طریقے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں، تو پھر عصمت و عفت کے اخلاقی اقدار غیر ضروری قرار پائیں گے۔ اس قسم کے دیگر متبادل طریقے کچھ زمانہ ہوا سوویٹ روس میں اختیار کئے گئے تھے لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اگرچہ سوویٹ روس نے ان طریقوں کو عرصہ ہوا ترک کر دیا لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ اب تک ان سے استشہاد کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خاندانی نظام انسانی معاشرہ کی بقا کے لئے غیر ضروری ہے اور چونکہ عفت و عصمت کے اقدار و تصورات اسی نظام سے وابستہ ہیں اس لئے اس کے خاتمہ کے ساتھ یہ تصورات بھی محو ہو جائیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خاندانی نظام کو ہٹا کر نسل انسانی کی بقا کے لئے اور کیا صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں اور کیا یہ صورتیں مفید اور قابل عمل ہیں۔ اس مسئلہ کا حل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق خاندانی نظام سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے متعین کرنے میں اس نظام کی نوعیت کو بہت بڑا دخل ہے۔

انسان اور دیگر حیوانات میں تین اہم اور مشترکہ میلانات ایسے پائے جاتے ہیں جو خاندانی زندگی کے لئے بمنزلہ بنیاد اور اساس کا کام دیتے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی میلان ایسا نہیں جو دورِ زمانہ سے ناپید یا فنا ہو سکتا ہے۔ اولاً جنسی کشش کا جذبہ۔ دوم جنسِ مقابل کے ساتھ دیرپا اور مضبوط تعلقات قائم کرنے کی خواہش۔ سوم زوجین کی یہ جبلّی خواہش کہ

وہ دونوں مل کر اولاد کی پرورش اور دیکھ بھال کریں، میویلاک ایلس جیسا ماہر جنسیات اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ قدامت پرست ہی قدامت پرست انسان کا نکاح و ازدواج کی ناکامی پر شور و واویلا مچانا بے سود ہے اسی طرح انقلاب پسند طبائع کی یہ آرزو بھی بیکار کہ نکاح و ازدواج کا طریقہ ختم ہو جائے اور اسکی جگہ کوئی دوسرا طریقہ وجود میں آجائے ۔ خاندانی نظام انسانیت کی دوصنفی ترکیب کا لازمی نتیجہ ہے ۔ اور کسی رسمی یا تاریخی وجہ سے وجود میں نہیں آیا ہے ۔ یہی مصنف ایک اور مقام پر لکھتا ہے :-

"اکثر اوقات اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ خاندانی نظام بید لچکدار ہے اور اسمیں یہ خصوصیت ہے کہ وہ بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں مختلف قالب اختیار کر لیتا ہے ۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ۔ انھوں نے بسا اوقات کل خاندانی زندگی کے پورے تصور کو مردود اور لائق نفرت قرار دیا ہے ۔ چونکہ ان کی گھریلو زندگی ناخوشگوار تھی اس لئے وہ خاندانی نظام ہی کو سرے سے نابود کر دینا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ اُن کے اندر جو عمدہ خصوصیات موجود ہیں اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ناخوشگوار خاندانی زندگی بھی اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے ۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کے تربیتی مراکز اور اسی قسم کے دیگر اجتماعی اداروں کے روز افزوں اضافہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خاندانی زندگی رفتہ رفتہ خود بخود تحلیل ہو کر نابید ہو جائے گی ۔ اس نکتہ خیال پر تنقید کرتے ہوئے فلائیڈ ڈیل لکھتا ہے :-

"معمولی خاندانی زندگی کی بہ نسبت ادارہ جاتی زندگی نتائج کے

اعتبار سے کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ اجتماعی اداروں
میں بچوں کی انفرادیت نشو و نما نہیں پا سکتی اور نہ اس قسم کی زندگی
میں انھیں ارتقائے شخصیت کے محرکات مل سکتے ہیں۔ ان اداروں
سے جو بچے پل کر نکلتے ہیں وہ بالکل بے روح ہوتے ہیں اور اُن
میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ بیرونی دنیا کے حالات کا مقابلہ
کر سکیں۔ ایسے بہترین قسم کے ادارے وہ ثابت ہوئے ہیں،
جنھوں نے گھریلو زندگی کو اپنے لئے نمونہ قرار دیا۔ لیکن اس کے
باوجود وہ ایک حقیقی گھریلو زندگی کا بدل مہیا کرنے میں ناکام رہے۔
اصلی خاندان اور اصلی والدین بچوں کی نشو و نما اور تربیت کے
لئے اتنی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں کہ بچوں کو ان کے والدین اور گھر
سے صرف اس صورت میں جدا کیا جاتا ہے جب اُس کے سوا کوئی
اور چارہ نہ ہو"

ڈیٹر مارک نے تہذیب مغرب میں ازدواج کے مستقبل سے بحث
کرتے ہوئے اسی عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں سویٹ روس کے ان
اداراتی طریقوں کا تذکرہ کرنے کے بعد جو بچوں کو خاندانی زندگی سے الگ
کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے وہ اس تجربہ کے نتائج کے بارے میں
لکھتا ہے :۔

"متعدد حقائق اس یقین کی تائید کرتے ہیں کہ والدین کی نگرانی
اور دیکھ بھال کا اولاد پر جو خوشگوار اثر ہوتا ہے اُس کا بدل
مہیا ہونا دشوار ہے اور یہ کہ ماں باپ کی شفقت و محبت بچوں
کی اخلاقی اور جذباتی نشو و نما کے لئے بیحد ضروری ہے۔ ان حالات

میں مجھے اس امر کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مستقبل قریب یا
بعید میں کوئی مملکت خاندانی نظام کو تحلیل و منتشر کر دینے کی کوشش
کرے۔ سوویٹ روس میں خاندان کو شبہ نگاہوں سے اس لئے
دیکھا جاتا تھا کہ کمیونسٹ نظریہ کی رو سے خاندان کا ذاتی ملکیت سے
گہرا رشتہ ہے۔ اور ابتدائی زمانہ میں سوویٹ روس کی انتہائی کوشش
یہ تھی کہ کسی طرح ذاتی ملکیت کا قلع قمع کیا جائے۔ اگرچہ سوویٹ روس
کے حکمراں اپنے نصب العین کی رو سے خاندانی نظام کے دشمن ہیں
لیکن موجودہ منزل پر وہ بھی معاشرتی استحکام کی خاطر خاندان کی
بقا کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اصل میں سوویٹ روس کے حکمرانوں
اور بالعموم کیمونسٹوں نے یہ امر نظر انداز کر دیا ہے کہ خاندان ایک بڑا
سخت جان ادارہ ہے۔ اس کی پائداری کا انحصار ذاتی ملکیت کے ہونے
یا نہ ہونے پر نہیں۔ خاندانی نظام کی اصل قوت زوجین کی باہمی محبت
اور بچوں کے ساتھ ان کی شفقت پر مبنی ہے اور بالشویکوں کے
متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ ان کا یقین ہے کہ ذاتی ملکیت کی اجتماعی ملکیت
میں تبدیلی سے ان روابط میں اور زیادہ استحکام پیدا ہوگا۔"

آخر میں ویسٹر مارک لکھتا ہے :۔

"جہاں تک میری بصیرت کام کرتی ہے میں اس امر کے یقین
کرنے کی وجہ پاتا ہوں کہ جنسی محبت میں حسی اور روحانی عناصر کی یکجائی
جس سے ایک مشترکہ گھر میں بہت سے افراد کا اجتماع و تالیف عمل میں
آتا ہے اور اولاد کی خواہش اور اس کے ساتھ محبت و الفت کے
جذبات یہ سب عوامل ایسے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاندانی نظام کو

باقی رکھیں گے۔ کیونکہ وہ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پیوست ہیں
اور ان کی تشفی کسی نہ کسی نوع کی ازدواجی اور خاندانی زندگی کے
ذریعہ ہی ممکن ہے"

ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاندانی نظام اجتماعی زندگی اور معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے اور وہ ان تمام مخالف قوتوں کے بالمقابل اپنے وجود کی حفاظت کر سکتا ہے جو اسے تحلیل کی طرف لے جانا چاہتی ہیں ایک مستحکم خاندان نہ صرف معاشرہ کے مفاد اور زوجین کے ارتقائے شخصی کے لئے ضروری ہے بلکہ آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت بھی اس پر موقوف و منحصر ہے۔ جن حالات سے خاندانی نظام کے استحکام میں خلل پیدا ہوتا ہے ان کو رفع کرنا معاشرہ اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ اگر ان بنیادی حقائق کی صحت تسلیم کر لی جائے تو عفت و عصمت کے تصورات کی معاشرتی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس طرز معاشرت کی رو سے مردوں اور عورتوں کے حقوق کا جو تعین عمل میں آتا ہے وہ اس تعین حقوق سے بدرجہا زیادہ انسب اور صحیح و درست ہے جو مساوات جنسی کے مجرد تصور کی بنا پر عمل میں آئے۔ اور جس میں خاندانی زندگی کی عملی مشکلات کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کی تقسیم میں جنسی مساوات کے خالص نظریاتی پہلو کو مد نظر تو ضرور رکھا ہے، لیکن اس نظریہ میں عملی زندگی کی مشکلات اور خاندانی نظم کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے جا بجا ترمیمات بھی کی ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم عورتوں کے ازدواجی حقوق پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے اور خاندان کو مستحکم کرنے کی غرض سے

اسلام نے نکاح کو ایک قانونی معاہدہ کی حیثیت دی ہے جو فریقین کی رضامندی سے پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتا ہے اور اسی طرح زوجین کی مرضی سے تحلیل بھی ہو سکتا ہے۔ اگر کچھ عرصہ کے بعد تجربہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ شوہر اور بیوی میں نباہ ممکن نہیں۔ عیسائی مذہب نے نکاح و ازدواج کو ناقابل فسخ قرار دیا تھا۔ بجز اس کے کہ شوہر یا بیوی میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر ازدواجی زندگی کسی فریق کے لئے ناقابل برداشت حد تک تلخ ثابت ہوتی تب بھی اس کے لئے اس پھندے سے گلو خلاصی ممکن نہ تھی۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلام نے انفساخ نکاح میں آسانی پیدا کر کے خاندانی نظم کو کمزور کر دیا مگر یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں جب زوجین اختلاف طبائع یا اور اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے نباہ نہ کر سکیں تو اس سے کوئی معاشرتی یا اخلاقی فائدہ نہیں کہ انھیں خواہ مخواہ اُن کی مرضی کے خلاف نکاح و ازدواج کی قید میں پا بہ زنجیر کر دیا جائے۔ ایک ناخوشگوار ازدواجی تعلق جس میں ہر وقت لڑائی جھگڑے ہوتے رہیں، نکاح کے اصل مقصد و منشا کو پورا نہیں کرتا، علاوہ ازیں اس میں ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں قید نکاح سے باہر کوئی ناجائز جنسی تعلقات پیدا کر لیں۔ اس کے علاوہ جب شوہر اور بیوی کے درمیان مستقل جھگڑے پیدا ہو جائیں تو اس کا اثر بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت پر بہت بُرا ہوتا ہے۔ اس لئے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے یہ بہتر ہے کہ جب فریقین کے باہمی تعلقات اس درجہ خراب ہو جائیں کہ اُن کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان باقی نہ رہے تو رشتۂ ازدواج کو منقطع کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ انہیں وجوہ سے اسلام نے رشتۂ نکاح کو ناقابل فسخ قرار دینے کے بجائے ایک باہمی قانونی معاہدہ کی حیثیت دی ہے جس میں فریقین ان شرائط کے ... ...

میں لازماً مضمر ہوتے ہیں۔ اپنی پسند کے دیگر شرائط بھی صراحتاً داخل کر سکتے ہیں اور ان شرائط کی عدم پابندی کی صورت میں فریقین عدالت میں رجوع کر سکتے ہیں شادی سے قبل میاں اور بیوی اپنے حقوق و فرائض کو صراحتاً طے کرکے معاہدہ نکاح میں شامل کر سکتے ہیں۔ ایسے شرائط معاہدۂ نکاح کا ایک لازمی حصہ قرار پائیں گے بشرطیکہ وہ اسلام کے متعین کردہ حقوق و فرائض سے متصادم نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سے ایک روایت ہے :۔

عن عمر ابن الخطاب قال اذا تزوج امراۃ وشرط لها ان لا یخرجها من مصرها فلیس له ان یخرجها

(شروح اربعہ۔ ترمذی)

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور عورت یہ شرط کرے کہ مجھے اس شہر سے باہر نہیں لے جانا ہوگا تو خاوند کو اس شرط کی پابندی کرنی چاہیئے۔

امام شافعی، امام احمد اسحٰق اور بعض اہل علم، حضرت عمرؓ کی اس رائے سے متفق ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ کو اس رائے سے اختلاف ہے۔

عن علی ابن ابی طالب انه قال شرط الله قبل شرطها کانه رای للزوج ان یخرجها وان کانت اشترطت علی زوجها ان لا یخرجها وذهب بعض اهل العلم الی هذا وهی قول سفیان الثوری وبعض اهل الکوفة

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ خدا کی شرط عورت کی شرط سے مقدم ہے۔ گویا آپ کے خیال میں خاوند کو بیوی کی اس شرط کا پابند نہیں رہنا چاہیئے کہ اسی شہر میں تم کو رہنا پڑیگا سفیان ثوری بعض اہل علم اور بعض کوفی بھی اسی طرف گئے ہیں۔

یہ اختلاف رائے اس امر کی نسبت ہے کہ آیا کوئی مخصوص شرط نکاح وازدواج کی بنیادی شرائط کی نقیض تو نہیں ہے۔ اس بارے میں صحابہ اور فقہا وغیرہ سب متفق ہیں کہ معاہدہ نکاح میں فریقین اپنے حسب مرضی شرائط داخل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کے مقرر کردہ شرائط کے خلاف نہ ہوں، یہ حق مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانی اپنی مشہور تصنیف نیل الاوطار میں لکھتے ہیں :۔

العشرۃ بالمعروف و الانفاق والکسوۃ والسکنیٰ وان لا یتصرف فی شیء من حقہا ومن قسمۃ ونحوھا وشرط علیہا ان لا تخرج الا باذنہ و لا تمنعہ نفسہا و لا تتصرف فی متاعہ الا برضاہ

(نکاح سے قبل بیوی مندرجہ ذیل شرائط پیش کر سکتی ہے) رہن سہن کا طریقہ حیثیت کے مطابق، روٹی کپڑا، مکان اور میرے جائز حقوق میں کتر بیونت نہ ہوگی۔ اور (مرد کی طرف سے یہ کہ) میری اجازت اور رضامندی سے کہیں باہر جانا ہوگا اور اپنے نفس کی خوشہ چینی سے مجھے نہیں منع کرنا اور میری رضامندی سے میری چیزیں صرف کرنا

پھر جس طرح مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کے باہر جانے یا نہ جانے کے بارے میں اپنی شرطیں پیش کرے اسی طرح عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ مردوں سے یہ شرط منوالیں کہ وہ مناسب موقعوں پر اور ضروریات کی تکمیل کے لئے باہر نکل سکیں گی۔ بہر حال اس قسم کی کئی شرطیں معاہدہ نکاح میں داخل کی جا سکتی ہیں۔ البتہ اُن میں سے بیشتر شرائط ایسی ہیں جن کا تصفیہ

عدالتوں میں دشوار ہے اور اُن کی پابندی کا معاملہ بالکل مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات کی خوشگواری یا ناخوش گواری پر موقوف ہے۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی رو سے نکاح کے بعد عورت کا ذاتی تشخص مرد کی شخصیت میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ شادی کے بعد وہ ایک علیحدہ قانونی شخصیت اور انفرادی تشخص کی مالک رہتی ہے۔ عیسائیت میں عورتوں کو شادی کے بعد یہ موقف حاصل نہیں رہتا، بلکہ قانون اور مذہب کی رو سے نکاح میں بیوی کی کوئی مستقل حیثیت نہیں رہتی اور اس کی انفرادی ذات شوہر کی ذات میں بالکل مدغم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر مس فیلڈ اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے:۔

"انجیل مقدس کا پہلا بڑا اصول یہ ہے کہ بیوی اور شوہر بعد نکاح ایک واحد شخصیت بن جاتے ہیں۔ اس اصول کو عیسائی قانون اور رواج میں پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قانون کی نظر میں شوہر اور بیوی ایک واحد شخص ہیں۔ جیسا کہ بلیک اسٹون نے لکھا ہے۔ نکاح و ازدواج سے جو قانونی حقوق، ذمہ داریاں اور فرائض پیدا ہوتے ہیں وہ سب اسی ایک اصول پر مبنی ہیں۔"

عیسائی قانون ازدواج کے برخلاف اسلام نے نہ صرف بیوی کی مستقل حیثیت اور شخصیت کو تسلیم کیا بلکہ اس کے موقف کو محفوظ کرنے کے لئے اُسے بعض معاشی حقوق بھی عطا کئے۔ مثلاً شوہر کو قانون کی رو سے اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بیوی کو مہر کی ایک معقول رقم ادا کرے۔ یہ رقم کتنی ہونی چاہئے اس کا دارومدار فریقین کے باہمی تصفیہ پر ہے۔ لیکن اس حکم کا اصل نشا یہ ہے کہ عورت مالی حیثیت سے اتنی مضبوط رہے کہ وہ بوقت ضرورت اپنے حقوق کی مدافعت کر سکے اور روپیہ، پیسے کی کمی کے باعث عدالتی کارروائی

کرنے سے نہ رُکے ۔ چنانچہ مہر کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

و آتوا النساء صدقتهن نحلة فان طبن لکم عن شیء منه نفساً فکلوه هنیئاً مریئاً
(سورۂ نساء)

اور عورتوں کو اُن کے مہر با بدل دو ۔ پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لئے خود دیں تو اُسے مزے سے خوش گواری سے کھاؤ ۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج و آتیتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئاً ۔ اتاخذونه بهتاناً واثماً مبیناً ۔ وکیف تاخذونه وقد افضی بعضکم الی بعض و اخذن منکم میثاقاً غلیظاً ۔

اور اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہو اور تم اُسے سونے کا ایک ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو ، کیا تم اسے بہتان سے اور کھلے گناہ سے لو گے اور تم اسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہونچ چکا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں ۔

اسلامی قانون کی رو سے کوئی نکاح جائز نہیں ہو سکتا جس کے لئے شوہر کی طرف سے مہر نہ ادا کیا گیا ہو ۔ اگر مہر کی مقدار معین نہ ہو تو بیوی کو مہر مثل یعنی ایک مناسب مہر دیا جائے گا ۔ خواہ معاہدہ نکاح میں صراحتاً یہ تحریر ہو کہ عورت کو مہر نہیں ملے گا ۔ مہر کی مناسب مقدار متعین کرنے میں اس مقدار

مہر کا لحاظ کیا جائے گا۔ جو بیوی کی رشتہ دار عورتوں کے نکاح کے
وقت متعین کیا گیا ہو۔ مثلاً عورت کی پھوپھی کو جو مہر وقت نکاح ادا کیا گیا
ہو اُسے معیار قرار دے کر اسی لحاظ سے مہر مثل کا تعین عمل میں آئے گا۔

ادائی مہر کو اسلام نے کتنی زبردست اہمیت دی ہے۔ اس کا اندازہ
حضرت عمر بن عبداللہ کی حسب ذیل روایت سے ہوگا :۔

عن ابن عمر ان رسول اللہ
صلعم نہیٰ عن الشغار و
الشغار ان یزوج الرجل
ابنتہ علیٰ ان یزوجہ الاخر
ابنتہ ولیس بینہما صداق
وفی روایۃ لمسلم قال لا
شغار فی اسلام

ابن عمر سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
شغار سے منع فرمایا اور شغار یہ
ہے کہ کوئی آدمی اپنی بیٹی دوسرے
کو اس شرط پر دے کہ وہ اپنی بیٹی
اسے دے گا اور دونوں کے درمیان
کوئی مہر نہ ہوگا۔ اور مسلم کی ایک
روایت میں ہے کہ اسلام میں
کوئی شغار نہیں۔

اسی طرح علقمہ بن مسعود کی ایک روایت ہے :۔

عن علقمۃ بن مسعود انہ
سئل عن رجل تزوج امرأۃ
ولم یفرض لہا شیئا ولم
یدخل بہا حتی مات فقال
ابن مسعود لہا مثل صداق
نسائہا لا وکس ولا شطط

علقمہ بن مسعود سے روایت
ہے کہ ان سے ایک شخص کے
بارے میں دریافت کیا گیا جس
نے ایک عورت سے شادی کی
مگر مہر مقرر نہیں کیا۔ پھر وہ
مباشرت کرنے سے پہلے ہی

وعليها العدة ولها الميراث فقام معقل بن سنان الا شجعي فقال قضى رسول الله صلعم فی بروع بنت واشق امراة منا بمثل ما قضيت ففرح بها ابن مسعود

(ترمذی و ابوداؤد نسائی)

فوت ہوگیا۔ ابن مسعود نے اس عورت سے کہا کہ اس کا مہر وہی ہوگا جو متوفی کی دوسری بیویوں کا تھا نہ کم نہ زیادہ اور آپ کے شوہر کی جائداد میں سے اس کا حصّہ ملے گا۔ یہ سُنکر معقل بن سنان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع بنت واشق کے معاملہ میں یہی فیصلہ کیا تھا تو ابن مسعود بہت خوش ہوئے

اسلام نے مہر کی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ اس معاملہ کو بالکلیہ فریقین کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ چاہیں تو بڑا سے بڑا مہر مقرر کرسکتے ہیں۔ اسی طرح کم سے کم بھی مہر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ ابن ماجہ اور ترمذی کی ایک روایت ہے

عن عامر بن ربيعة ان امراة من بنی فزارة تزوجت على نعلين فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ارضيت من نفسك قالت نعم فاجاز

عامر بن ربیعہ کا بیان ہے کہ قبیلہ بنی فزارہ کی ایک عورت نے جوتیوں کے ایک جوڑہ مہر پر کسی مرد سے نکاح کیا۔ حضور نے ان خاتون سے فرمایا کیا تم دل سے اس نکاح مہر پر خوش

ہو۔ خاتون نے کہا ہاں۔ آپ نے
فرمایا تمہاری مرضی۔

حضرت عمر کا خیال تھا کہ مہر کی مقدار زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ ترمذی اور
ابن ماجہ کی ایک روایت ہے:۔

عن ابی العجفاء قال قال عمر بن الخطاب الا تغالو صدقة النساء فانها لو كانت مكرمة فى الدنيا او تقوىٰ عند الله لكان اولا كم بها نبى الله صلى الله عليه وسلم ما علمت رسول الله صلى الله عليه وسلم نكح شيئاً من نسائه ولا انكح شيئاً من بناته على اكثر من ثنتى عشرة اوقيه

ابو العجفاء کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا، عورتوں کے مہر باندھنے میں زیادتی نہ کرو کیونکہ اگر یہ چیز دنیاوی لحاظ سے قابل عزت اور اللہ کے نزدیک لائق تکریم ہوتی ہو تو حضور سب سے پہلے اس پر عمل کرتے (برخلاف اس کے آپ کے عمل سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ) آپ نے خود اپنی ازواج مطہرات کا اور اپنی بیٹیوں کا بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں باندھا اور بارہ اوقیہ کے چار سو اسی درہم ہوتے ہیں۔

لیکن حضرت عمر کی رائے سے ایک عورت نے اختلاف کرتے ہوئے
قوی دلائل سے ثابت کیا کہ مہر کی مقدار کا معاملہ بالکلیہ فریقین کی مرضی
پر ہے اور اس بارے میں اسلام نے کوئی خاص حد نہ تو متعین

کی ہے اور نہ مہر کی کمی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے۔ چنانچہ مصنف نیل الاوطار لکھتے ہیں۔

عن عمر انه قال لاتغالوا فی مهر النساء فقالت امراة لیس ذالک یا عمر ان الله تعالیٰ یقول وآتیتم احداهن قنطاراً من ذهب (کما فی قراة ابن مسعود) فقال عمر اصابت امراة ورجل اخطا۔

حضرت عمر نے فرمایا اپنی عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھا کرو ایک عورت نے کہا اے عمر آپ کو اس بندش کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے اگر تم نکاح کے وقت عورتوں کو مہر کی صورت میں ایک خزانہ بھی دیدو تو مفارقت کے وقت واپس نہ لو۔ معلوم ہوا کہ صاحب استطاعت لوگ بڑے سے بڑا مہر بھی باندھ سکتے ہیں۔ تو تم منع کرنے والے کون۔ حضرت عمر نے عورت کی بات سُنکر کہا عورت ٹھیک بات کہتی ہے۔ مجھ سے چوک ہوگئی۔

مقدار مہر وقت نکاح بھی معین کی جاسکتی ہے اور نکاح کے بعد بھی۔ نیز اس میں بعد نکاح اضافہ بھی عمل میں آسکتا ہے۔ اگر شوہر کم عمر ہو تو اُس کا باپ اُس کی طرف سے مقدار مہر کا تعین کر سکتا ہے۔ عورت چاہے تو شادی کے بعد شوہر کو مہر کی ادائیگی سے معاف بھی کر سکتی ہے۔ اگر عورت مہر معاف نہ کرے اور شوہر کی طرف سے اس کی ادائیگی عمل میں نہ آئے تو عورت نا ادائی

مہر مباشرت سے انکار کرسکتی ہے۔ نیز مباشرت سے قبل شوہر کی طرف سے بیوی پر عدم ادائی حقوق کا دعویٰ ہو تو مہر کی عدم ادائیگی اس دعویٰ کو باطل کردینے کے لئے کافی ہے اور ایسے دعویٰ کو عدالت خلاف قانون قرار دے سکتی ہے۔ اگر دعویٰ مباشرت کے بعد دائر کیا گیا ہو تو عدالت اپنے فیصلہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کرسکتی ہے کہ عورت کا مہر ادا کردیا جائے۔ شوہر کی وفات کی صورت میں اُس کے وارث ادائی مہر کے لئے ذمہ دار ہوں گے، لیکن ہر وارث کو مہر کا اتنا ہی حصہ ادا کرنا پڑیگا جتنا حصہ اُس نے میراث میں پایا ہے۔ اگر شوہر کی وفات کے وقت اس کی جائداد بیوی کے قبضہ میں ہو تو وہ تا ادائی مہر اس پر قبضہ برقرار رکھ سکتی ہے۔ نیز ایسی صورت میں اس کا یہ حق باطل نہ ہوگا کہ وہ شوہر کے وارثوں پر ادائی مہر کا دعویٰ دائر کرے۔ البتہ دعویٰ دائر کرتے وقت اُسے جائداد پر قبضہ ترک کرنا پڑے گا۔

عورتوں کی معاشی حالت کو اور زیادہ مستحکم کرنے کی غرض سے اسلام نے صنف نازک کو مکمل حقوق ملکیت عطا کئے ہیں۔ لڑکی کو وراثت میں لڑکوں کی بہ نسبت نصف حصہ کا مالک قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر کسی شخص کی صرف ایک ہی لڑکی ہو اور کوئی لڑکا نہ ہو تو اسے باپ کی کل جائداد کا نصف حصہ ملے گا، البتہ اگر اولاد ذکور نہ ہو، لیکن ایک سے زائد لڑکیاں ہوں تو تمام لڑکیوں میں دو ثلث جائداد مساوی طور پر تقسیم کردی جائے گی۔ بیوہ کو متوفی شوہر کی جائداد کا آٹھواں حصہ ملتا ہے لیکن اگر شوہر لاولد ہو تو چوتھا حصہ ملے گا، اسلام نے جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کے مابین کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ چنانچہ اسلامی قوانین کی رُو سے کل جائداد

منقولہ اور غیر منقولہ وارثوں میں مقررہ تناسب کے لحاظ سے تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اس طریق تقسیم پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کو بمقابلہ لڑکوں کے نصف حصّہ دیکر اُن کی مساوی حیثیت ختم کر دی گئی ہے لیکن یہ الزام اس لئے غلط ہے کہ عورتوں کو نہ صرف اُن کے شوہروں سے مقررہ مقدار مہر وصول ہوتی ہے بلکہ شوہر کے ترکہ میں بھی اُن کا الگ حصّہ ہوتا ہے۔ اس طرح باپ کے ترکہ میں لڑکیوں کا جو حصّہ کم ہے اُس کی تلافی دوسرے ذرائع سے ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا قابل لحاظ امر یہ ہے کہ مرد پر معاشی کفالت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ لیکن عورتوں کو اس ذمہ داری سے بری قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ایک دائرہ میں اُن کے حقوق کم رکھے گئے ہیں تو دوسرے دائرہ میں اُن کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی نسبت سے کم ہے۔

ازدواجی زندگی کی خوش گواری یا ناخوشگواری کا دارومدار بہت کچھ اس امر پر بھی ہے کہ فریقین اپنی پسند اور مرضی سے ایک دوسرے کا انتخاب کریں اور کوئی دوسرا شخص اُن کے اس حقوق میں مداخلت نہ کرے۔ اسلام نے جہاں عورتوں پر اور احسانات کئے ہیں وہاں اس معاملہ میں بھی انھیں پوری پوری آزادی دی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے رسم ورواج سے متاثر ہو کر عورتوں سے اُن کا یہ حق چھین لیا۔ ورنہ اسلامی احکام کی رُو سے عورتیں اپنے حق انتخاب زوج میں بالکل مردوں کی طرح خود مختار اور آزاد ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر اپنے صحابیوں سے بہ اصرار کہا کہ وہ شادی سے قبل ہونے والی بیوی کی شکل وصورت ضرور دیکھ لیں تاکہ انتخاب میں غلطی نہ ہو۔

مسلم کی ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ نے بیان فرمایا ہے :۔

عن ابی هریرة قال جاء رجل الی النبی صلعم فقال انی تزوجت امراة من الانصار قال فانظر الیها فان فی اعین الانصار شیئاً۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں انصار کی ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آنحضرت نے فرمایا اس عورت کو دیکھ لو۔ کیونکہ انصار کی آنکھوں میں عموماً کچھ نقص ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت جابر کی روایت ہے :۔

عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا خطب احدکم المراة فان استطاع ان ینظر الی ما یدعوه الی نکاحها فلیفعل

حضرت جابر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نکاح کا خواہاں ہو تو اگر وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہو کہ نکاح میں آنے والی عورت کو دیکھ سکے تو اُسے ایسا ضرور کرنا چاہیئے۔

اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے :۔

عن المغیرة بن شعبه قال خطبت امراة فقال لی

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے انھوں نے کہا میں نے

رسول اللہ صلعم هل نظرت الیها قلت لا قال فانظر الیها قلت لا قال فانظر الیها فانه احریٰ ان یودم المودة بینکما

ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کیا تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے دیکھ لو، کیونکہ اس سے تم دونوں کے درمیان اور زیادہ محبت ہوگی

فقہائے اسلام کا یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ فریق ثانی کی شکل و صورت دیکھنے کا یہ حق عورت کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے میں دولہا اور دلہن دونوں کے لئے قبل از نکاح ایک دوسرے کو دیکھنا جائز ہے۔ امام مالک کی رائے ہے کہ دولہن کی اجازت ضروری ہے۔ یعنی بغیر اجازت ہونے والے شوہر کو منگیتر کی شکل و صورت نہیں دیکھنی چاہیئے۔ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ اجازت ہو یا نہ ہو ہونے والی بیوی اور شوہر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اجازت محض اس لئے دی گئی ہے کہ عورت اور مرد اپنا جوڑا منتخب کرنے میں آزاد ہوں چنانچہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ عورت کی صریحی رضامندی کے بغیر کوئی نکاح جائز نہیں۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے :۔

عن ابی هریرة قال قال

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے

رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تنکح الایم حتیٰ تستامر ولا تنکح البکر حتیٰ تستاذن قالو یا رسول الله وکیف اذنها قال ان تسکت

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے مشورہ نہ کیا جائے اور باکرہ عورت سے نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت حاصل نہ کرلی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس کی رضامندی یا نا رضا مندی کا حال کیسے معلوم ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ خاموش رہے۔ (یعنی صراحتاً انکار نہ کرے) تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ راضی ہے۔

اسی طرح مسلم کی ایک حدیث میں کہا گیا ہے :-

عن ابن عباس ان النبی صلی الله علیه وسلم قال الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها واذنها صماتها وفی روایة قال الثیب احق

ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ اپنے ولی سے زیادہ اپنا معاملہ فیصل کرنے کی حقدار ہے اور غیر شادی شدہ لڑکی کے نکاح سے قبل اس

بنفسها من ولیها والبکر
یستامر واذنها سکوتها
وفی روایته قال الثیب
احق بنفسها من ولیها
والبکر یستاذنها ابوها
فی نفسها واذنها صماتها

کی اجازت لی جائے اور اس
کی اجازت اس کی خاموشی ہے
ایک اور روایت میں ہے کہ
بیوہ اپنے معاملہ میں اپنے ولی
سے زیادہ حق دار ہے اور
غیر شادی شدہ لڑکی سے اس
کی اجازت لی جائے اور اس
کی اجازت اس کا سکوت ہے۔

نیز حضرت ابوہریرہ کی ایک اور روایت ہے:-

عن ابی ھریرۃ قال قال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم الیتیمہ تستامر فی
نفسها فان صمتت فھو
اذنها وان ابت فلا
جواز علیها
(ترمذی ونسائی)

ابوہریرہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے کہا کہ بالغ لڑکی سے اس
کے بارے میں پوچھا جانا
ضروری ہے۔ اگر وہ خاموش
رہے تو یہ اس کی اجازت
ہے اور اگر انکار کردے
تو اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا
جا سکتا ہے۔

ان احکام کا اصل مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو اپنی آزاد مرضی
سے اپنا شوہر منتخب کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ لیکن مسلمانوں نے
جہاں اور احکام دین کو مسخ کر ڈالا، وہ [illegible] نے عملاً ان کا یہ

حق بھی چھین لیا۔ اب لڑکیوں سے ان کی آئندہ زندگی اور انتخاب زوج کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا۔ ماں باپ یا اولیاء جس مرد کو پسند کرتے ہیں۔ لڑکی پر اس کی مرضی کے بغیر مسلط کر دیتے ہیں اور نکاح کے وقت صرف رسمی طور پر استفسار کر لیتے ہیں۔ لیکن نہ کسی لڑکی میں یہ جرارت ہے کہ وہ صریحاً اپنے ہونے والے شوہر کی نسبت ناپسندیدگی کا اظہار کر سکے اور نہ سوسائٹی میں احکام اسلامی کی اتنی پاسداری ہے کہ اگر کوئی لڑکی اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے ماں باپ کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اسے خوشی سے اس امر کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنا شوہر خود منتخب کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے صریح احکام کے باوجود ہمارے یہاں عورتیں اور لڑکیاں شوہر کے انتخاب میں آزاد نہیں اور انہیں چار و ناچار ماں باپ یا بزرگوں کے انتخاب پر راضی ہو جانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان کی آئندہ ازدواجی زندگی اکثر اوقات ناخوشگوار ہوتی ہے۔

اسلامی قانون کی رو سے نکاح کے لئے دو گواہوں کا موجود رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اعلان نکاح ایک ضروری امر ہے۔ مخفی سازدارانہ جنسی تعلقات اور نکاح میں فرق یہی ہے کہ نکاح کا فعل علانیہ طور پر اور علی رؤس الاشہاد عورت اور مرد کے مابین جنسی تعلقات کا موجود ہونا ثابت کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ناجائز جنسی تعلقات عموماً مخفی رکھے جاتے ہیں اور ان کے مخفی رکھنے کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ فریقین اس تعلق کی معاشرتی ذمہ داریاں اور ان سے پیدا ہونے والے فرائض سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے

اعلان نکاح کے ساتھ دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ترمذی کی ایک روایت اس بارے میں درج ذیل ہے:۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البغایا التی ینکحن نفسھن بغیر بینۃ۔	ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورتیں بغیر گواہوں کے نکاح کرلیتی ہیں وہ زانیہ ہیں

بعض مکاتیب خیال کے نزدیک نکاح کے لئے ولایت شرط ہے یعنی ولی کی موجودگی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض احادیث میں ولایت کا ذکر آیا ہے اور چند ایک روایات میں ولی کی موجودگی ضروری قرار دی گئی ہے۔ مثلاً بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے:۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نکاح الا بولی	ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بغیر ولی کے نکاح نہیں ہوسکتا

غالباً یہ حکم نابالغ لڑکیوں کے نکاح سے متعلق ہے۔ کیونکہ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ بیوہ یا بالغ عورت کا نکاح بغیر ولی کے بھی ہوسکتا ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کو اس سے اختلاف ہے۔ اُن کی رائے میں نکاح کے لئے ولی کی موجودگی ضروری ہے۔ چونکہ نکاح پر رضامندی یا عدم رضامندی بالکلیہ مردوں اور عورتوں کا اختیاری معاملہ ہے اس لئے اگر ولی کی موجودگی ضروری خیال کیا جائے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ولی کا کام یہ ہے کہ وہ عورت کے حقوق کی

نگہداشت کرے۔ کیونکہ بعض اوقات عورتیں اپنے حالات اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے حقوق کی قرار واقعی حفاظت نہیں کرسکتیں۔ اور یہ خدشہ رہتا ہے کہ معاہدہ نکاح میں کوئی ایسی بات رہ جائے جس سے اُن کے جائز حقوق متاثر ہوں۔ اس خطرہ کو رفع کرنے کے لئے ولی کی موجودگی کو ضروری قرار دیا گیا ہوگا، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ جب مرد اور عورت دونوں انتخاب زوج کے معاملہ میں آزاد ہیں تو ولی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس تعبیر کی مزید تائید ترمذی کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

عن عائشہ ان رسول اللہ صلعم قال ایما امرأۃ نکحت نفسہا بغیر اذن ولیہما فنکاحہا باطل فنکاحہا باطل فنکاحہا باطل فان دخل بہا فلہا المہر بما استحل من فرجہا فان اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی لہ۔	حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے اس کا نکاح باطل ہے اُس کا نکاح باطل ہے۔ پھر اگر اس کا شوہر اس سے مباشرت کرے تو اس کو مہر ادا کرنا ہوگا۔ اگر دونوں میں جھگڑا ہو تو جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان (اسٹیٹ) ہے۔

اس حدیث میں دو باتیں قابل غور ہیں وہ یہ کہ ولی کی عدم موجودگی کے باوجود آپ نے ایسے نکاح کو قابل انفساخ قرار نہیں دیا، جس میں

عورت کا کوئی ولی نہ ہو۔ شوہر اس سے مباشرت کر سکتا ہے اور اُس کے بدلے مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محض اس بات سے نکاح فسخ نہیں ہو سکتا کہ عورت کا کوئی ولی نہ تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو سکتا تو پھر آپ یہ کیوں فرماتے کہ عورت سے مباشرت کے بعد شوہر کو مہر ادا کرنا ہوگا اس کے علاوہ آپ نے یہ فرمایا کہ جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو تو اسٹیٹ اس کی ولی ہوگی اور یہ اس صورت میں جب کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی جھگڑا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ولی کی سرپرستی آپ نے عورت کے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری خیال کی۔ جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو اور نہ اسٹیٹ اس کے قانونی حقوق کی نگہداشت کرنے پر آمادہ ہو وہ شوہر سے اختلافات یا لڑائی کی صورت میں ضرور نقصان اُٹھائے گی اس لئے ولی کی موجودگی کی شرط محض اس لئے ہے تاکہ عورت کے حقوق کی مدافعت کی جاسکے نہ اس لئے کہ عورت کو انتخاب زوج کی آزادی حاصل نہیں یا اس کے لئے ولی کی رائے کو ماننا ضروری ہے۔

حسب ذیل احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب زوج کا آخری فیصلہ عورت کی اپنی رائے اور مرضی پر منحصر ہے نہ کہ ولی یا ماں باپ کی مرضی پر :-

عن ابن عباس قال ان جاریۃ بکراتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ان اباھا زوجھا وھی کارھۃ فخیرھا النبی صلعم

ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک لڑکی رسول اللہ صلعم کے پاس آئی اور بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی ہے مگر اُس کو یہ شادی ناپسند ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے اختیار دیا کہ چاہے
تو نکاح قائم رکھے اور چاہے
تو فسخ کردے

عن خنساء بن خذام ان اباها زوجها وهي ثيب فكرهت ذالك فاتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فرد نكاحه

خنساء بن خذام سے روایت ہے کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کردی جو اُس کو ناپسند تھی پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نکاح فسخ کردیا۔

نسائی میں حضرت عائشہ سے ایک اور روایت ملتی ہے جس میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک لڑکی نے آکر بیان کیا کہ میرے والد نے اپنے بھانجے سے میری شادی کردی ہے اور میں اُسے ناپسند کرتی ہوں۔ میں نے کہا ٹھہرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد میں ان سے بیان کروں گی۔ جب آپ تشریف لائے تو میں نے سارا واقعہ سنایا۔ آپ نے فوراً اس لڑکی کے والد کو بلا بھیجا اور اصل واقعہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی نے واقعات صحیح بیان کئے ہیں پھر آنحضرت نے اس سے کہا کہ تم آزاد ہو چاہو تو نکاح قائم رکھو یا فسخ کردو، لڑکی نے کہا میں نکاح قائم رکھتی ہوں کیونکہ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس بارے میں عورتیں کچھ حقوق رکھتی ہیں یا نہیں۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر نے بیان کیا ہے، کہ عثمان بن مظعون ایک لڑکی چھوڑ کر وفات پاگئے۔ میرے چچا قدامہ نے

اس کی شادی میرے ساتھ کردی۔ وہ اس شادی کو ناپسند کرتی تھی اور مغیرہ بن شعبہ سے نکاح کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کے حسب خواہش اس کا نکاح مغیرہ بن شعبہ سے کردیا گیا۔

مندرجہ بالا تمام روایات و احادیث سے اس امر کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ اسلام نے انتخاب زوج کے بارے میں عورت کو اتنی ہی مکمل آزادی عطا کی ہے جتنی مرد کو اور عورت کے نکاح کے لئے ولی کی موجودگی کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ابھی تک عورت کی پوزیشن محفوظ نہیں تھی اس کے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے اس کا کوئی سرپرست اور نگراں ضرور موجود رہے رہی یہ حقیقت کہ قانون کی نگاہ میں عورت اور مرد دونوں کے مابین کامل مساوات ہے تو اس بارے میں مسلمانوں کے مابین نہ کبھی کوئی اختلاف رائے تھا اور نہ ہے۔ مرد کا کوئی قانونی حق ایسا نہیں جس کے مقابلہ میں اسلام نے عورت کا کوئی مساوی حق نہ رکھا ہو۔ لیکن جنسی مساوات ہو، سیاسی مساوات ہو یا اور کسی نوع کی مساوات محض قانون کے جبر و تشدد سے اس کا نفاذ عمل میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ انسانی تعلقات کا بڑا حصہ حکومتی قوانین کی گرفت سے خارج ہوتا ہے اور قانون اخلاق بالآخر حکومت اور معاشرہ کے جبری قوانین سے زیادہ کارگر اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات پر یہ اصول اور زیادہ صادق آتا ہے۔ اگر شوہر اور بیوی کے تعلقات صرف قانونی حقوق کی اساس پر قائم ہوں تو گھر کی زندگی ایک مستقل جہنم بن جائے اور ازدواجی تعلقات میں جو لطف و مسرت اور رحمت و مودت ہونی چاہئے۔ وہ کبھی نہ پیدا ہو۔ اس

لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کو مضبوط کرنے کے لئے علاوہ قانونی حقوق کے اسلام نے اخلاقی ہدایات کیا دی ہیں کیونکہ عورتوں کا مرتبہ بالآخر انہیں ہدایات کی روسے متعین ہوگا۔ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں نے بالعموم اپنی مذہبی تعلیمات سے کتنی غفلت برتی ہے اور کس طرح اس کے ان پہلوؤں کو توڑ مروڑ کر بگاڑ دیا ہے جن کا تعلق عورتوں کی مساوات اور اُن کے معاشرتی مرتبہ سے ہے۔

اس ضمن میں ہمیں سب سے پہلے قرآن کی تعلیمات کو دیکھنا چاہیئے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات کی نسبت کیا ہدایات دی گئی ہیں اور ان کے اندر کون سے عمومی اصول اور کلی مقاصد کارفرما ہیں۔ قرآن نے جہاں صنفی تخلیق کا ذکر کیا ہے وہاں اس بات کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ عورتوں کی تخلیق کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ وہ مردوں کے جذبہ حکمرانی کا تختہ مشق بن کر رہیں یا صنف غالب انھیں اپنے شہوانی جذبات اور حیوانی خواہشات کا آلہ کار بنا کر رکھے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے:-

ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنو الیها وجعل بینکم مودة ورحمة

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے اس نے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم قائم کیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن رحمت اور مودت کو ازدواجی

تعلقات کی اساس قرار دیتا ہے نہ کوئی قانونی حقوق کو نیز جہاں وہ یہ بتاتا ہے کہ عورتیں تمہارے لئے تسکین کا ذریعہ ہیں وہاں وہ اس سے جذبات شہوانی کی تسکین مراد نہیں لیتا بلکہ روحانی تسکین جس میں جسمانی تقاضوں کی تکمیل بطور ایک عنصر کے شامل ہے لیکن کل حقیقت نہیں۔ پھر وہ اس خیال کی بھی تردید کرتا ہے کہ عورت کوئی کمتر مخلوق ہے جس کا اپنا کوئی مستقل عقلی اور روحانی وجود نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

یا ایھا الناس اتقو ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھا رجالا کثیراً ونساء

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم تمام کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور پھر اس میں اس کا جوڑا بنایا اور اس میں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔

یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو ہم نے تم کو مرد و عورت بنا کر پیدا کیا اور خاندان و قبائل کی شکل میں بنایا۔ یہ محض اس لئے کیا کہ تم ایک دوسرے کی تمیز کر سکو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو وہی شخص عزت دار ہے جو سب سے زیادہ اس کے قانون سے ڈرنے والا ہے۔

ازدواجی زندگی کے دیگر مسائل کی نسبت قرآن نے جو احکامات بیان کئے ہیں اُن میں بھی مودت رحمت کا یہی عام اصول کار فرما نظر آتا ہے۔ مثلاً ایسی عورتوں کے ساتھ جنھیں ان کے شوہر طلاق دینا چاہیں قرآن حسب ذیل سلوک کی تائید کرتا ہے:۔

یا ایھا الذین آمنو لا یحل لکم ان ترثو النساء کرھاً ولا تعضلوھن لتذھبو ببعض ما اتیتمو ھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینہ وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیرہ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لئے جائز نہیں کہ عورتوں کو زبردستی ورثہ میں لو اور نہ ان کو روک رکھو، اس لئے کہ اس کا کچھ حصّہ ان سے لے لو جو تم نے انھیں دیا ہے بجز اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں اور ان کے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو، پھر اگر تم اُنھیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدو ومن یفعل ذالک فقد

۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد کو پہونچنے لگیں تو یا انھیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ

ظلم نفسہ

رخصت کردو اور اُن کو
دُکھ دینے کے لئے روک نہ رکھو
اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان
پر ظلم کرتا ہے۔

ان دونوں آیات میں عورتوں کی تکالیف کو محض قانون کی عینک سے دیکھنے کے بجائے قرآن نے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور ان کے ساتھ اس طرح برتاؤ کا حکم دیا ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ اپنی آزاد اور مستقل ہستی رکھتی ہیں۔

اسی طرح دوسری آیات میں بھی عورتوں کے ساتھ فیاضانہ اور مساویانہ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً:-

وان طلقتموھن من قبل
ان تمسوھن وقد فرضتم
لھن فریضۃ فنصف ما
فرضتم الا ان یعفون او یعفو
الذی بیدہ عقدۃ
النکاح وان تعفوا اقرب
للتقوی ولا تنسوا الفضل
بینکم

اور اگر تم ان کو طلاق دے
دو قبل اس کے کہ تم نے ان
کو چھوا ہو اور تم اُن کے لئے
مہر مقرر کر چکے ہو تو اس کا
آدھا دے دو جو مقرر کیا ہو
مگر یہ کہ وہ معاف کردیں یا وہ
معاف کردے جس کے ہاتھ
میں نکاح کی گرہ ہے اور اگر
تم معاف کردو تو یہ تقویٰ سے
قریب تر ہے اور آپس میں نیک
سلوک کرنا نہ چھوڑو، بے شک

جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے
دیکھتا ہے۔

کسی عورت کو ایک مرتبہ طلاق دے دینے کے بعد اس کے شوہر کے لئے کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ وہ اس کے ساتھ فیاضی کا سلوک اور محبت کا برتاؤ کرے۔ لیکن قرآن کا اصرار ہے کہ جب تک مرد اور عورت کے درمیان ضعیف ترین تعلق اور کمزور ترین رشتہ بھی قائم ہے اس وقت تک شوہر کو اس کے ساتھ مہربانی اور مروت سے پیش آنا چاہئے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

اسکنوھن من حیث سکنتم	انھیں اپنے مقدور کے مطابق
من وجدکم ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن وان	وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو اور انھیں تنگ کرنے کے لئے
کن اولات حمل فانفقوا	تکالیف نہ پہونچاؤ اور اگر
علیھن حتی یضعن حملھن	حمل والیاں ہوں تو ان پر خرچ
فان ارضعن لکم فاتوھن	کرتے رہو یہاں تک کہ وضع
اجورھن وأتمروا بینکم	حمل کریں۔ پھر اگر وہ تمہارے
بمعروف وان تعاسرتم	لئے دودھ پلائیں تو انھیں انکی
فسترضع له اخری لینفق	اجرت دو اور آپس میں پسندیدہ
ذو سعة من سعته و	طور پر مشورہ کرو اور اگر تم ایک
من قدر علیه رزقه	دوسرے سے تنگی محسوس کرو تو
فلینفق مما آتاہ اللہ۔	اس کے لئے دوسری عورت
لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاھا	دودھ پلائے گی۔ چاہئے کہ

وسعت والا اپنی وسعت کے
مطابق خرچ کرے اور جس پر
اُس کی روزی تنگ ہے وہ
اس سے خرچ کرے جو اللہ
نے اُسے دیا ہے اور اللہ
کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر
اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے

مطلقہ عورت کے ساتھ قرآن نے کتنے فیاضانہ سلوک کی تاکید کی ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ مرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بچوں کے دودھ پلانے کی اُجرت بھی مطلقہ عورت کو ادا کرے۔ اسی فیاضانہ برتاؤ اور حسن معاشرت کی تاکید احادیث میں بھی کثرت سے ملتی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے:—

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر (مسلم)	حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ کوئی مومن مرد عورت (بیوی) سے ناراض نہ ہو اس کا کوئی وصف قابل اعتراض ہوگا تو دوسرے اوصاف یقیناً ناقابل اعتراض ہونگے

حضرت عائشہ کی روایت ہے:—

عن عائشۃ قالت قال رسول	حضرت عائشہ کا بیان ہے

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
خیرکم خیرکم لاھلہ و
انا خیرکم لاھلہ
(ترمذی)

کہ تم (مردوں) میں سے بہتر
وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے
بہتر ہے اور میں خود اپنے
اہل و عیال کے لئے بہتر ہوں

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں
کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عن عمرو بن العاص انہ
شھد حجۃ الوداع مع
النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وحمد اللہ واثنیٰ علیہ
و ذکرو و وعظ ثم قال
استوصوا بالنساء خیراً
فانما ھن عندکم عوان
لیس تملکون منھن شیئاً
غیر ذالک الا ان یاتین
بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن
فاھجروھن فی المضاجع
واضربوھن ضرباً غیر
مبرح فان اطعنکم فلا
تبغوا علیھن سبیلاً ان لکم
من نسائکم حقاً فاما

حضرت عمرو بن العاص کا بیان
ہے کہ میں حجۃ الوداع کے موقع
پر موجود تھا۔ آپ نے وہاں
خدا کی تعریف و توصیف اور
وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا کہ
میں تمہیں عورتوں کے بارے میں
بھلائی کی وصیت کرتا ہوں اور
یہ تمہارے نزدیک قیدیوں سے
زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں لیکن یاد
رکھو تمہیں اس سے زیادہ حق
نہیں اگر وہ بمقتضائے بشریت
کوئی کھلی بے حیائی کا کام کر
گزریں تو ان کو ان کے بستروں
میں الگ چھوڑ دو اور معمولی
طور پر مارپیٹ سے بھی کام لے

حقکم علیٰ نسائکم فلا یوطین فرشکم من تکرھون ولا یاذن فی بیوتکن لمن تکرھون الا وحقھن علیکم ان تحسنوا الیھن فی کسوتھن وطعامھن
(ترمذی)

سکتے ہو اگر وہ آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کرلیں تو بہانہ بناکر تم ان کو کس مپرسی کی حالت میں نہ چھوڑو۔ کیونکہ کچھ حقوق عورتوں کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں اور کچھ حقوق تم مردوں کے عورتوں پر عائد ہوتے ہیں۔ عورتوں پر یہ حقوق ہیں کہ جسے تم ناپسند کرو اسے وہ گھر میں نہ آنے دیں اور نہ تمہارے بستر ان سے خراب کروائیں اور تم پر عورتوں کے یہ حقوق ہیں کہ اُن کے کھانے کپڑے میں تنگی نہ کرو اور اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ

بستر مرگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ارشادات غلاموں اور عورتوں کے حقوق سے متعلق تھے:۔

آخر ما وصیٰ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ ثلث تکلم بھن حتی تلجلج لسانہ وخفی کلامہ۔ الصلوۃ الصلوۃ ماملکت

حضور نے وصال کے قریب اور بالکل آخری وقت میں جبکہ آپ کی زبان مبارک تتلانے لگی تھی، تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ نماز پڑھتے

ایمانکم لا یکلفوھم مالا یطیقون اللہ اللہ فی النساء فانھن اعوان فی ایدیکم اخذ تموھن بامانۃ اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ

رہنے کی تاکید ۔ غلاموں سے بہتر سلوک کرنے کا حکم حتیٰ کہ ان سے اتنی مشقت بھی نہ لو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کرنے کی تاکید ۔ خدا سے ڈرو اور عورتوں کے حقوق نظر انداز نہ کرو عورتیں تمہارے ہاتھوں میں قیدیوں کی مانند ہیں ۔ تم نے ان کا ہاتھ اللہ کی امانت سمجھ کر پکڑا ہے ۔ ان کی شرم گاہیں اللہ کے کلمے کے ذریعہ تمہارے لئے حلال ہوئی ہیں ۔

ایک اور موقعہ پر حضور نے فرمایا :-

اوصانی جبرئیل علیہ السلام بالمرآۃ حتی ظننت انہ لا ینبغی طلاقھا الا من فاحشۃ بینۃ ۔

جبرئیل نے عورت کے حقوق کے بارے میں مجھے اتنی مرتبہ وصیت کی کہ میں نے یقین کر لیا کہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کئے ہوئے بغیر اسے طلاق دینا جائز نہیں ۔

حضرت بہز بن حکیم کی روایت ہے :-

عن بہز بن حکیم قال قلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماتقول فی نسائنا قال اطعموھن مما تاکلون واکسوھن مما تکسون ولاتضربوھن ولا تقبحوھن
(کنزالعمال)

حضرت بہز بن حکیم کا بیان ہے کہ میں نے حضور سے عرض کیا عورتوں کے بارے میں آپ کی تعلیم کیا ہے۔ حضور نے فرمایا جو خود کھاؤ وہ اُن کو بھی کھلاؤ اور جیسا تم خود پہنو ویسا ان کو بھی پہناؤ۔ نہ ان کو مارو نہ جھڑکو۔

حضرت عائشہ کا بیان ہے :-

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما النساء شقائق الرجال۔
(کنزالعمال)

حضرت عائشہ کا بیان ہے حضور نے فرمایا عورتیں مردوں کے لئے دل پسند پھول ہیں (ان پھول کو ایذارسانی اور تکلیف دہی کے سخت ہاتھوں سے مسل کر برباد نہ کرو)

جہاں تک عورتوں کے گھریلو فرائض کا تعلق ہے اسلام نے اس بارے میں عورتوں کو ہر قسم کی ادنیٰ مشقتوں سے آزاد کردیا ہے اسلامی احکام کی رو سے جن کو اب مسلمانوں نے بالکل پس پشت ڈال دیا ہے عورت پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ مرد کے لئے کھانا پکائے یا برتن دھوئے۔ نہ اُس کو کپڑے دھونے۔ جھاڑو دینے اور دیگر دستی مشاغل پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شوہر کے بچوں کو

دودھ پلانا بھی عورتوں کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت اس قسم کے کام کرنے سے انکار کر دے تو اس کا شوہر اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ حضرت عمر کے فرائض پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ عقود اللجین کے مصنف لکھتے ہیں:۔

وروی ان رجلاً جاء الی
عمر یشکو الیه حق زوجته
فوقف ببابه منتظرة فسمع امرأته
تستطیل علیه بلسانها وهو ساكت
لا یرد علیها فانصرف الرجل
قائلاً اذا كان هذا حال امیر
فراه مدبر فناداه ما
حاجتك. فقال یا امیر المؤمنین
جئت اشکو الیك خلق زوجتی و
استطالتها علی فسمعت زوجتك
كذالك فرجعت وقلت اذا
كان حال امیر المؤمنین مع
زوجته فكیف حالی۔ فقال له
عمر انی احتملتها لحقوق
لها انها طباخة لخبزی
غسالة لثیابی مرضعة
لولدی ولیس ذالك بواجب

ایک صاحب اپنی بیوی کی
شکایت لیکر حضرت عمر کے
دروازے پر پہونچے وہاں جاکر
سنا کہ امیر المومنین کی بیوی ان
سے زبان درازی کر رہی ہیں
اور آپ بالکل خاموش ہیں۔ کچھ
جواب نہیں دیتے۔ یہ سُن کر وہ صاحب
یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ جب
امیر المومنین کا یہ حال ہے تو میں
کس شمار و قطار میں ہوں حضرت
عمر گھر سے باہر نکلے اور یہ دیکھ کر
کہ آنے والے صاحب واپس
جا رہے ہیں۔ آپ نے آواز دی
اور فرمایا کس لئے آئے تھے۔
انھوں نے کہا جناب اپنی بیوی
کی شکایت لیکر حاضر ہوا تھا کہ
وہ بڑی زبان درازی کرتی ہے

علیہا ولیسکن قلبی بہا
عن الحرام فانا احتملہا
لذالک فقال الرجل یا
امیرالمومنین ولذالک
زوجتی قال عمر فاحتملہا
یا اخی فانہا مدۃ یسیرۃ

لیکن جب میں آپ کے در دولت
پر حاضر ہوا اور آپ کی بیوی
کی کیفیت دیکھی تو اپنے دل کو
یہ سمجھا کر واپس جا رہا تھا کہ جب
امیرالمومنین کا یہ حال ہے تو میرا
کہنا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب
دیا کہ بھائی میں جو اپنی بیوی کی
تلخ و ترش باتیں سُنکر خاموش ہو جاتا
ہوں تو اُس کی وجہ محض اس کے
کچھ حقوق ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ
وہ میرا کھانا پکاکر باورچی سے
اور کپڑے دھوکر دھوبی سے
اور میرے بچوں کو دودھ پلاکر
انا کے بوجھ سے مجھے بے نیاز
کئے ہوئے ہے۔ خصوصاً ایسی
حالت میں جبکہ ان سب باتوں کی
ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی
پھر یہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے
میرے دل کا سکون قائم ہے
اور میں حرام سے بچا ہوا ہوں
ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر

اُس کے ناجائز برتاؤ کو بھی سہہ
لیتے ہوں میں نے عرض کیا یہی
حال میری بیوی کا ہے حضرت
عمر نے فرمایا تم بھی مندرجہ بالا
وجوہات کی بنا پر اس کی باتوں کو
برداشت کرلو، دنیا چند روزہ ہے
اور اس کی تکلیفات بھی جلد
ختم ہو جانے والی ہیں۔

گھریلو زندگی کے دائرہ میں عورت کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے اس کا مرتبہ قریب قریب مرد کے برابر ہے البتہ چونکہ اہم معاملات کے تصفیہ میں بالآخر ایک ہی فریق کی رائے فیصلہ کن ہوسکتی ہے اس لئے مرد کو ایک درجہ مگر صرف ایک ہی درجہ فضیلت حاصل ہے جیسا کہ حسب ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم قال کلم راع و مسئول عن رعیته فالامام راع و مسئول عن رعیته والرجل راع و مسئول عن رعیته و المراة

حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ حضور نے فرمایا تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اس کی ذمہ داری کی بابت اس سے سوال ہوگا۔ امام بھی ذمہ دار ہے۔ ہر گھر کا بڑا شخص بھی ذمہ دار ہے گھر کا ملازم بھی ذمہ دار ہے اور گھر کی ملکہ (عورت) بھی ذمہ دار

وھو مسئول عن رعیتہ ہے ۔ ان میں سے ہر شخص اس
(بخاری ۔ مسلم ۔ ابو داؤد کی ذمہ داری کے بارے میں
ترمذی) سوال کیا جائے گا ۔

اس حدیث سے عورتوں کے مرتبہ کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ اس تصور سے بالکل مختلف ہے جس کی رو سے مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم قرار دیا جاتا ہے ۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ عمل میں کچھ اختیارات اور کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے ، امام بھی ، شوہر بھی ، بیوی بھی اور نوکر بھی گویا کہ اپنے اپنے دائرہ میں یہ سب لوگ مختار اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بالکل برابر ہیں ۔ فرق جو کچھ ہے درجات کا اور دائرہ فرائض کا ہے ۔ اس صاف اور واضح تعین حقوق کے بعد اس حدیث کو کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کرے ۔ عورت کی معبودیت اور محکومیت کا یہ تصور ہند و فلسفہ اور روایات سے ماخوذ ہے ۔ حضور کے نام نامی کو اس سے وابستہ کرنا توہین رسالت ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کی آزاد اور مستقل ہستی تسلیم کی ہے اور انھیں سوسائٹی میں عزت و احترام کا وہی درجہ دیا ہے جو مرد کو ، البتہ دونوں کے دائرہ عمل بعض صورتوں میں مشترک اور بعض صورتوں میں الگ ہیں ۔

طلاق

جیسا کہ گذشتہ باب میں لکھا جا چکا ہے۔ اسلامی احکام کے لحاظ سے نکاح کی نوعیت ایک دائمی تعلق کی نہیں ہے جس کو بجز غیر معمولی حالات کے کسی صورت میں فسخ نہ کیا جا سکتا ہو۔ چونکہ اسلام نے نکاح کو ایک معاہدہ کی حیثیت دی ہے اس لئے وہ اسے فسخ کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ اگر شرائط معاہدہ کی تکمیل عمل میں نہ آئے مردوں اور عورتوں کو انتخاب زوج کا جو حق دیا گیا ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کا اختیار بھی حاصل ہو۔ جیسا کہ امریکی مصنفہ مارگریٹ میڈ لکھتی ہے۔ "آزادی انتخاب کے ساتھ قدرتاً زوجین کو یہ حق بھی حاصل ہونا چاہئے کہ وہ تجربہ کے بعد اپنی رائے بدل سکیں۔ اگر انسانی عمل کے اور تمام دائروں میں گذشتہ غلطیوں اور خطاؤں کی تلافی کی جا سکتی ہے تو ازدواجی زندگی کو اس اصول سے کیوں مستثنیٰ کیا جائے۔ اسی طرح اگر ازدواجی تعلق کی حقیقت زوجین کے جوش رفاقت میں مضمر ہے تو جس وقت دونوں فریقوں کا جذبہ رفاقت ختم ہو جائے۔ اس تعلق کی حقیقت بھی ضائع ہو جاتی ہے جو فریق اس کے بعد بھی فریق ثانی سے چمٹا رہے تو وہ دوسرے کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور اس کی آزادی میں خواہ مخواہ مخل انداز ہوتا ہے۔

یہ تصور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے کہ طلاق فی نفسہٖ ایک خراب اور ناجائز فعل ہے جو اصول اخلاق کے منافی اور روحانیت

کی ضد ہے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نظریہ نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ اس سے کئی قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ عیسائی اقوام کی حالیہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اس پر وہاں عمل نہ ہو سکا بلکہ اُس کا ردّ عمل اتنا طاقتور رہا کہ اب عیسائی ممالک میں کثرت طلاق کے باعث خاندانی نظم کی پائیداری رخصت ہوتی جا رہی ہے اور گھریلو زندگی کا سکون و اطمینان ختم ہو گیا ہے۔

رومن کیتھولک عقیدہ کے لحاظ سے فعل مباشرت کے بعد نکاح ایک دائمی تعلق کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور آئندہ اس رشتہ کو توڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نکاح کلیسا اور مسیح کے اتحاد کا ۔۔۔ مظہر ہے اور جس طرح یہ اتحاد ناقابل شکست ہے اسی طرح رشتۂ نکاح بھی ناقابل انفساخ ہے۔ نیز قانون فطرت کی طرح وہ بھی ایک دائمی اور مستقل نوعیت رکھتا ہے۔ خدا نے ابتداہی میں ارشاد فرمایا تھا کہ بیٹا والدین کو چھوڑ کر بیوی سے ہم آغوش ہوگا اور دونوں متحدالذات ہو جائیں گے۔ اس نظریہ کے باوجود رومن کیتھولک کلیسا کو مستثنیٰ حالات میں طلاق کی اجازت دینی پڑی اور وہ اس طرح کہ اگر فریقین میں سے کوئی یہ ثابت کر دے کہ نکاح میں ابتداہی سے کوئی بے ضابطگی رہ گئی ہے تو زوجین کی علیحدگی عمل میں آ سکتی ہے۔ لارڈ برائس نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ان مستثنیٰ صورتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اتنے کثرت سے قواعد وضوابط بنائے گئے کہ نہایت آسانی سے ہر نکاح میں کوئی نہ کوئی قانونی سقم ثابت کر کے

زوجین ایک دوسرے سے پیچھا چھڑا سکتے تھے۔ مثلاً ایک شوہر یہ کہہ کر نکاح فسخ کرا سکتا تھا کہ اس کی بیوی کسی دور دراز رشتہ سے اس کی بہن ہوتی ہے یا یہ کہ جوانی کے زمانہ میں اسے اپنی بیوی کی سگی بہن سے محبت تھی یا وہ بیوی کے کسی رشتہ دار کا دینی باپ رہ چکا ہے۔

بہت زمانہ تک مغربی قانون سازوں نے نکاح کے ناقابل انفسخ ہونے کا عقیدہ تسلیم نہیں کیا، لیکن شارلمین کے زمانہ سے مغربی ممالک کی قانون سازی اس عقیدہ سے روز بروز متاثر ہوتی گئی۔ صرف انیسویں اور بیسویں صدی میں جاکر رومن کیتھولک ممالک نے طلاق کو جائز قرار دیا۔ اب بھی عیسائی ممالک میں اس عقیدہ کا اتنا اثر ہے کہ جنوبی کیرولینا کی امریکی ریاست میں طلاق قانوناً ناجائز ہے۔ حالانکہ اس ریاست کے باشندوں کی اکثریت رومن کیتھولک کلیسا سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مذہباً پروٹسٹنٹ ہے۔

پروٹسٹنٹ فرقہ کے مصلحین نے رومی کلیسا کے اس نظریہ کو کبھی نہیں مانا۔ نکاح ایک ناقابل انفساخ اور دائمی حالت ہے جس کا اختتام زوجین میں سے کسی ایک کی موت پر ہی عمل میں آسکتا ہے۔ ان سب نے اس امر پر اتفاق کیا کہ زوجین میں سے کوئی ایک فعل زنا کا ارتکاب کرے تو اس فعل کو طلاق کی ایک معقول وجہ قرار دینی چاہئے۔ اس کے علاوہ بہت سے مصلحین نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اگر شوہر یا بیوی عمداً ایک دوسرے سے عرصہ دراز تک کے لئے بے خبر رہیں تو طلاق ہوسکتی ہے پروٹسٹنٹ مصلحین کے ان نظریات نے رفتہ رفتہ مغربی

ممالک کے قانون سازوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ان ممالک میں متعدد قوانین منظور کئے گئے جن میں مختلف وجوہات کی بنا پر طلاق کو جائز قرار دیا گیا۔

عیسائیت کے برعکس اسلام نے شروع ہی سے طلاق کی ضرورت اور حکمت کو تسلیم کرتے ہوئے ایسی تمام صورتوں میں تفریق زوجین کی اجازت دی جبکہ شوہر اور بیوی کے تعلقات میں اس حد تک بدمزگی اور تلخی پیدا ہوگئی ہو کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے اور باہمی مصالحت کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔ اس کے باوجود اسلام طلاق کے مواقع کو محدود رکھنا چاہتا ہے اور کثرت طلاق کو بُری نظروں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اگر معمولی معمولی باتوں پر زوجین میں تفریق کا عمل واقع ہونے لگے اور طلاق کی اجازت کو کڑی شرطوں سے مشروط نہ کردیا جائے تو خاندانی نظم کا استحکام رخصت ہو جائے اور گھریلو زندگی میں کوئی پائداری باقی نہ رہے۔ اس لئے طلاق کی اجازت دیتے ہوئے اسلام نے اسے محدود کرنے کی غرض سے کئی پابندیاں اور متعدد قیود بھی عائد کردئے ہیں تاکہ لوگ نکاح و طلاق کے معاملہ کو کھیل نہ بنالیں۔

مردوں اور عورتوں کو شریعت اسلام کی رو سے پوری آزادی دی گئی ہے کہ اگر وہ محسوس کریں کہ فریق ثانی کے ساتھ ان کا نباہ ناممکن ہے تو رشتہ نکاح سے گلو خلاصی حاصل کرکے پھر سے ازدواجی زندگی کا آغاز کریں۔ لیکن ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو ایک بُرا فعل قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابغض الحلال عند اللہ الطلاق
(ابوداؤد)

ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

لعن اللہ علی کل ذواق مطلاق

ہر طالب لذت کثرت سے طلاق دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

ان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات

اللہ تعالیٰ مزے چکھنے والے اور مزے چکھنے والیوں کو ناپسند کرتا ہے۔

ایما امرأۃ اختلعت من زوجھا بغیر نشوز فعلیھا لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین

جب کسی عورت نے اپنے شوہر سے اس کی زیادتی کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہو گی۔

مردوں کو طلاق کے معاملہ میں بہ نسبت عورتوں کے زیادہ آزادی عطا کی گئی ہے لیکن ان پر بھی کئی ایک شرطیں اور قیدیں عائد کی گئی ہیں۔ اولاً انھوں نے بیویوں کو جو کچھ مہر ادا کیا ہوا سے وہ واپس لینے کے مجاز نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذوا منہ

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو اور تم اسے سونے کا

شیئاً اتاخذونہ بھتانا واثما مبیناً وکیفتاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض واخذن منکم میثاقاً غلیظاً

ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔ کیا تم اُسے بہتان سے اور کھلے گناہ کے ساتھ لوگے اور تم اسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہونچ چکا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔

دوئم اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو اُسے ایک ایک ماہ کے وقفے سے تین طلاقیں دینی ہوں گی اور تیسری طلاق پر زوجین میں علیحدگی عمل میں آئے گی۔ بہ یک وقت تین طلاقیں دینا گناہ ہے۔ اس شرط کی مصلحت یہ ہے کہ تین ماہ کے عرصہ میں ممکن ہے باہمی مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ یا عورت اور مرد کے برتاؤ میں کوئی ایسا خوشگوار تغیر ہو جائے جس سے طلاق کی ضرورت باقی نہ رہے۔ چنانچہ قرآن کا حکم ہے :-

اَلطلاق مرتن فامساک "بمعروف او تسریح" باحسان

(بقرہ - ۱۸)

طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا شریفانہ طور سے رخصت کر دیا جائے۔

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثہ قروء... وبعولتھن احق بردھن فی ذالک

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں رکھیں ... اگر ان کے شوہر اصلاح کا

ان ارادو اصلاحاً ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت
(بقرہ - ۱۸) میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ
حقدار ہوں گے۔

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا بہ یک وقت تین طلاقوں سے عورت کی علیحدگی عمل میں آسکتی ہے۔ اکثر کی رائے یہی ہے کہ اگر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو بھی ان کا اثر وہی ہوگا جو تین ماہ کے فاصلے سے تین طلاقیں دینے کا اثر ہوتا یعنی علیحدگی عمل میں آجائے گی۔ لیکن امام احمد ابن حنبل اور امام تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ بہ یک وقت تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جائے گا۔ یعنی علیحدگی اسی صورت میں عمل میں آئے گی جب تین طلاقوں میں ایک ایک ماہ کا فصل ہو۔ عام فقہا کے برعکس امام ابن تیمیہ نے اس بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ کئی وجوہ سے اسلامی تعلیمات سے قریب تر اور منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ اولاً یہ بات ظاہر ہے کہ تین طلاقوں کے بعد علیحدگی عمل میں لانے کا اصل منشا یہ تھا کہ زوجین میں مصالحت کا موقعہ باقی رہے۔ اگر بہ یک وقت تین طلاقوں کا اثر بھی وہی ہو جو تین ماہ کے فصل سے تین طلاقوں کا ہوتا ہے تو قرآن کا منشا فوت ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث و روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اس قسم کی طلاق کو ایک بڑا سخت گناہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر ایسے اشخاص کو سزا دلوایا کرتے تھے جو اپنی بیویوں کو بہ یک وقت تین طلاقیں دے کر علیحدہ کر دیتے۔ حضرت ابن عباس سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں

انه قد عصیٰ ربه و بانت امراته	ان کا کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا اُس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی عورت اس سے جُدا ہوگئی۔

حضرت علی فرماتے ہیں لو ان الناس اصابو حد الطلاق ما ندم احد علی امراته (اگر لوگ طلاق کی ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی کو اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا)۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر سخت حیرت انگیز ہے کہ فقہا نے بیک وقت تین طلاقوں کو قانوناً وہی حیثیت دی ہے جو ایک ایک ماہ کے فصل سے تین طلاقوں کو ہمارے خیال میں موجودہ زمانہ کی مسلمان حکومتوں کو عام فقہا کے برعکس امام احمد اور امام ابن تیمیہ کی رائے پر عمل کرنا چاہئے۔

پہلی دو طلاقوں کے دوران میں شوہر اور بیوی کو یکجا رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اگر شوہر نے جلد بازی سے کام لیا ہو یا محض وقتی جذبات سے متاثر ہو کر طلاق دے دی ہو تو وہ اپنے فیصلہ کو منسوخ کرکے بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کرلے۔ قرآن حکیم کی ہدایات اس بارے میں حسب ذیل ہیں :۔

الطلاق مرتن فمساك بمعروف او تسریح باحسان (بقرہ)	طلاق دو مرتبہ ہے پھر یا تو بھلے طریقہ سے روک لیا جائے یا شریفانہ طریقہ سے چھوڑ دیا جائے۔
والمطلقت یتربصن بانفسھن	مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین

ثلثۃ قروء ... وبعولتھن احق بردھن فی ذالک ان ارادو اصلاحًا

حیضوں تک انتظار میں رکھیں ... اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں گے۔

اگر تین ماہ کے بعد بھی مرد اپنے فیصلہ پر قائم رہے تو تیسری طلاق آخری اور فیصلہ کن ہوگی۔ اس کے بعد شوہر اگر مطلقہ بیوی کو دوبارہ قید نکاح میں لانا چاہے تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی بیوی کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے بعد اس سے طلاق نہ حاصل کرے۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عورت کا دوسرا شوہر بعد نکاح اسے فوراً طلاق دے دے اور دونوں کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوں۔ ایسی صورت میں عورت کا پہلا شوہر اس سے نکاح نہیں کرسکتا، کیونکہ دوبارہ نکاح کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ عورت کا دوسرا شوہر اس سے مقاربت کرچکا ہو۔ چنانچہ حضرت عائشہ کی روایت ہے :-

عن عائشہ قالت جاءت امرأۃ رفاعہ القرظی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت انی کنت عند رفاعہ فطلقنی فبت طلاقی فتزوجت بعدہ عبدالرحمٰن

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انھوں نے بیان کیا کہ میں رفاعہ کے نکاح میں تھی، پھر رفاعہ نے مجھے طلاق دے دی

بن الزبیر وما معه الا هدبة الثوب فقال اتریدین ان ترجعی الی رفاعة نعم قال لا حتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتک

اور طلاق کو پختہ کردیا۔ اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر سے شادی کرلی اور ان کے پاس ایک کپڑے کے ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ کیا تم رفاعہ کے ساتھ پھر نکاح کرنا چاہتی ہو۔ تو رفاعہ کی بیوی نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا تم ان سے نکاح نہیں کرسکتیں جب تک تم ان کا مزہ اور وہ تمہارا مزہ نہ چکھ لیں۔

اصل میں یہ شرط اس لئے رکھی گئی ہے تاکہ لوگ طلاق بائن دیتے ہوئے پوری پوری احتیاط ملحوظ رکھیں اور طلاق کی اجازت سے بیجا فائدہ نہ اٹھائیں۔

طلاق کے لئے ایک اور شرط یہ رکھی گئی ہے کہ مرد کو زمانہ حیض میں طلاق نہیں دینا چاہئے۔ اس شرط کی مصلحت یہ ہے کہ زمانہ حیض میں بالعموم عورتوں کا مزاج بہت چڑچڑا ہوجاتا ہے اور وہ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے جھگڑنے لگتی ہیں۔ اس جسمانی مجبوری کے باعث بعض اوقات عورتوں سے ایسے افعال سرزد ہوجاتے ہیں جن پر وہ بعد میں خود بھی ندامت محسوس کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوران حیض میں مردوں اور عورتوں کے جنسی تعلقات معطل رہتے

ہیں۔ پھر چونکہ مرد اور عورت کے جنسی جذبات وخواہشات ہی بالآخر ان کے مابین محبت والفت کا رشتہ قائم کرتے ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ دوران حیض میں جو تلخیاں اور بدمزگیاں میاں بیوی کے درمیان پیدا ہوں وہ جنسی تعلقات کے دوبارہ قیام پذیر ہونے پر خودبخود دور ہو جائیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے زمانہ حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی حضرت عمر نے اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ آپ یہ شکر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ عبداللہ کو حکم دیدو کہ وہ طلاق واپس لیں اور جب اُن کی بیوی حیض سے پاک ہو جائے تب پھر سے طلاق دیں۔ اسی واقعہ کی نسبت ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر کو اس فعل پر ملامت فرمائی اور طلاق کا حسب ذیل طریقہ بتایا:۔

"ابن عمر تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو۔ پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ تیسری مرتبہ طاہر ہو تو اس وقت یا تو بالکل طلاق دیدو یا اُس کو روک لو۔"

حضرت ابن عمر نے فرمایا یا رسول اللہ أرأیت لو کنت طلقتھا ثلاثاً الان لی ان اراجعھا (اگر میں اسے تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا" اس پر آنحضرت نے فرمایا لا کانت تبین وتکون معصیۃ (نہیں وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا)۔

یہاں تک ہم نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ مردوں کو طلاق

کے معاملہ میں اسلام نے کتنی آزادی دی ہے اور اس آزادی کے حدود کیا ہیں نیز اسے کن شرائط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ مردوں کی طرح اسلام نے عورتوں کو بھی رشتہ نکاح سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی مساوی آزادی دی ہے۔ چنانچہ عورتیں دو طریقوں سے ایسے شوہر سے پیچھا چھڑا سکتی ہیں جس کا برتاؤ ٹھیک نہ ہو یا جس کو وہ کسی اور وجہ سے ناپسند کرتی ہوں، اولاً بیوی اور شوہر باہمی علیحدگی پر رضا مند ہوجائیں تو بیوی کو خود بخود چھٹکارا مل جاتا ہے۔ اس صورت کو خلع کہا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر شوہر کسی طرح اسے علیحدہ کرنے پر رضا مند نہ ہو تو بیوی عدالتی کارروائی کر سکتی ہے اور عدالت سے علیحدگی کا حکم حاصل کر سکتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان اصول مساوات کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا۔ کیونکہ مرد اپنی زبان کی ایک جنبش سے بیوی کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ لیکن عورت کے لئے مرد کی رضا مندی حاصل کرنی یا بصورت دیگر عدالتی کارروائی کرنی ضروری ہے۔ بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح اسلام نے عورت کو ایک مشکل میں مبتلا کر دیا ہے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ عورت کے معاملہ میں حکومت اور اس کی عدالت کو مداخلت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کی بہتر حفاظت عمل میں لائی جاسکے۔ زمانہ قدیم سے تا ایندم انسان کے معاشرتی حالات ایسے رہے ہیں کہ عورتوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ مردوں کی طرح اپنے بل بوتے پر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ یہ بات نہ صرف مشرق کے پسماندہ ممالک کی حد تک

صحیح ہے بلکہ مغربی ممالک میں بھی جہاں عورت نے بہت کچھ آزادیاں حاصل کرلی ہیں اور جہاں معاشی حیثیت سے بھی وہ ایک گونہ مطمئن ہے عورتوں کے لئے مردوں کی بہ نسبت اپنے حقوق کی حفاظت دشوار ہے۔ زمانہ اسلام میں عورت کی معاشی اور معاشرتی پوزیشن اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ تن تنہا مردوں کا مقابلہ کرسکتی۔ اس لئے اسے حکم دیا گیا کہ وہ حکومت کی امداد اور سرپرستی طلب کرے۔ تاکہ مرد اس کے قانونی حقوق میں اگر مداخلت کرنا بھی چاہے تو اُسے ایک طاقتور سرپرست کی اعانت حاصل رہے۔ اس لئے عدالت کا توسط اختیار کرنے سے عورت اپنے حقوق کی مدافعت اور زیادہ مؤثر طریقہ سے کرسکتی ہے اور ان موانع کو بھی دفع کرسکتی ہے جو مرد اس کے قانونی حقوق کے استعمال میں پیدا کرسکتے ہیں۔

جس طرح مردوں کو طلاق کی اجازت دینے سے اسلام کا یہ منشا نہیں کہ طلاق کوئی بُرا فعل نہیں ہے اسی طرح عورتوں کو باہمی رضامندی یا عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ شوہر سے علیحدگی کا جو حق دیا گیا ہے اُس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام عورت کے مطالبہ تفریق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسلام نے ایسے مردوں اور عورتوں کی علانیہ مذمت کی ہے جو اپنے حق طلاق یا تفریق کو غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

عن ثوبان قال قال رسول	
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت ثوبان سے روایت
ایما امراۃ سالت زوجہا	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

طلاقاً فی غیر ما باس فحرام علیها رائحة الجنة المختلعات هن المنافقات

وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی عورت اپنے شوہر سے بلا قصور طلاق چاہے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ خلع کو کھیل سمجھنے والی عورتیں منافق ہیں۔

ان ہدایات سے مقصود یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی خاندانی نظم کے استحکام کو خواہ مخواہ بلا ضرورت نقصان پہنچانے سے باز رہیں اور صرف حقیقی ضروریات یا مجبوری کی صورت میں حق تفریق سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس قسم کی اخلاقی ہدایات سے قطع نظر عورتوں کو تفریق کا پورا پورا قانونی حق حاصل ہے۔ چاہیں تو وہ اپنے شوہروں کو راضی کر کے خلع حاصل کرلیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو عدالت سے رجوع ہو کر تفریق حاصل کریں دونوں صورتوں میں عورت کو مہر سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس طرح طلاق میں مرد اور خلع میں عورت کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالی قربانی کا خیال اُن کے لئے ایک بڑی زبردست رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اگر عورتوں اور مردوں کو مہر کا نقصان برداشت نہ کرنا پڑتا تو طلاق اور خلع کی راہ میں سے ایک بڑی رکاوٹ دور ہو جاتی اور تفریق زوجین کے واقعات کثرت سے ظہور پذیر ہوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانونی فیصلوں سے ان اصولوں پر روشنی پڑتی ہے جن کے مطابق عدالتوں کو تفریق

زوجین کے مسئلہ میں کارروائی کرنی پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور واقعہ ثابت بن قیس کا ہے جن کی دو بیویوں نے تفریق کا مطالبہ کیا۔ ثابت کی ایک بیوی جمیلہ بنت ابی سلول تھیں انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تفریق کا مطالبہ کیا :-

یا رسول اللہ لا یجمع راسی وراسہ شئی ابدا انی رفعت جانب الخباء فرایتہ اقبل فی عدۃ فاذا ھو اشدھم سوداً و اقصرھم قامۃ واقبحھم وجھا۔	یا رسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز جمع نہیں کر سکتی میں نے اپنا گھونگٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ پستہ قد اور سب سے زیادہ بدشکل ہے۔

ایک اور روایت میں ہے :-

عن ابن عباس ان امراۃ ثابت بن قیس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت بن قیس اما انی ما اعیب علیہ فی خلق ولا دین ولکنی اکرہ	حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ ثابت کی بیوی حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض گذار ہوئیں کہ حضور میرے خاوند کا خلق بھی مجھ سے اچھا ہے اور دین میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں ان

الکفر فی الاسلام فقال
رسول الله صلی الله علیه
وسلم اتردین علیه حدیقته
قالت نعم ۔ قال رسول الله
صلی الله علیه وسلم اقبل
الحدیقة وطلقها تطلیقة
(بخاری)

کے ساتھ رہ کر انکی نافرمانی
کرکے اسلام میں کفر کو دعوت
نہیں دے سکتی ۔ آپ نے
فرمایا کیا تم اس کا مہر میں دیا ہوا
باغ اسے واپس لوٹا دو گی۔
اُس نے کہا ہاں حضور، آپ
نے اُس کے خاوند ثابت سے
کہا اپنا باغ واپس لے لو اور
اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔

ثابت کی ایک اور بیوی کا واقعہ حسب ذیل ہے :۔

عن حبیبة بنت سهل انها
کانت تحت ثابت بن قیس
وان رسول الله صلی الله
علیه وسلم خرج الی الصبح
فوجد حبیبة بنت سهل
عند بابه فقال رسول
الله صلی الله علیه وسلم
من هذه قالت انا حبیبة
بنت سهل یا رسول الله
فقال ما شانك قالت لا
انا ولا ثابت بنت قیس

حضرت حبیبہ کا بیان ہے کہ
میں ثابت بن قیس کے نکاح
میں تھی لیکن ہم دونوں میں باہمی
ناچاقی ہو گئی ۔ حضور صبح کی نماز
کے لئے جب گھر سے نکلے تو حبیبہ
کو گھر کے دروازے پر پایا (سخت
اندھیرا ہونے کی وجہ سے)
آپ نے فرمایا کون ہے ۔ میں
نے کہا میں ہوں ۔ حبیبہ بنت سہل
آپ نے فرمایا کیوں خیریت ۔ میں
نے کہا حضور میں اور ثابت بنت

لزوجها فلما جاء ثابت
بن قيس - قال له رسول
الله صلى الله عليه وسلم
هذه حبيبة بنت سهل قد
ذكرت ما شاء الله ان تذ
فقالت حبيبة يا رسول الله

قیس اب ایک جگہ نہیں رہ سکتے
پھر ثابت آئے آپ نے فرمایا
تمہاری بیوی حبیبہ آئی تھیں
اور اُنھوں نے مجھ سے بہت
باتیں کیں وہ کہتی ہیں میرے
خاوند نے مجھے جو کچھ مہر میں دیا
ہے وہ میرے پاس موجود ہے
اس لئے اب تم حبیبہ سے اپنا دیا
ہوا مہر واپس لے لو اور اُن کو
چھوڑ دو۔ چنانچہ ثابت بن قیس نے
حبیبہ سے مہر میں دی ہوئی چیز
واپس لے لی اور وہ اپنے گھر
بیٹھ گئیں۔

اسی واقعہ کی نسبت ابو داؤد کی ایک اور روایت بھی
ملتی ہے :-

عن عائشة ان حبيبة
بنت سهل كانت عند ثابت
بن قيس فضربها فكسر
بعضها فاتت النبي صلى
الله عليه وسلم بعد
صبح فدعا النبي صلى الله

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ
حبیبہ ثابت بن قیس کے نکاح
میں تھی۔ (دونوں میں کچھ ناچاقی
ہوئی) اور ثابت نے حبیبہ کو
اتنا مارا کہ اس کی ہڈی ٹوٹ
گئی۔ حبیبہ صبح کے وقت حضور

علیه وسلم ثابتًا فقال خذ بعض مالها وفارقها فقال ويصلح ذالك يارسول الله قال نعم قال اصدقتها حديقتين وهما بيدها فقال النبي صلى الله عليه وسلم خذهما ففارقها ففاعل

(ابوداؤد)

کی خدمت میں حاضر ہوئی اور تمام واقعہ بیان کیا، پس حضور نے ثابت کو بلایا اور فرمایا جیبہ سے کچھ مال لے لو اور اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔ ثابت نے کہا حضور کیا یہ مناسب ہے آپ نے فرمایا ہاں ثابت نے کہا حضور میں نے جیبہ کو مہر میں دو باغ دیئے تھے اور وہ ابھی تک جیبہ کی ملکیت میں ہیں حضور نے فرمایا جاؤ دونوں باغ واپس لے لو لیکن اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ چنانچہ ثابت نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمر کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک عورت نے تفریق کی درخواست کی۔ آپ نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ شوہر سے علیحدگی اختیار کرے بلکہ مصالحت کی کوشش کرے لیکن عورت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور تفریق پر مصر رہی۔ حضرت عمر نے اسے ایک اندھیری کوٹھری میں تین روز تک بند رکھا۔ چوتھے روز جب وہ باہر آئی تو اس سے پوچھا کہ تم پر کیسی گزری، اس نے کہا کہ مجھے ان تینوں دنوں میں گھر سے زیادہ سکون ملا۔ اس پر حضرت عمر نے دونوں کا نکاح فسخ کر دیا۔

ان تینوں واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کسی وجہ سے

اپنے شوہر سے تنگ آگئی ہو اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر راضی نہ ہو تو یہ امر تفریق زوجین کی کافی اور معقول وجہ ہے ثابت بن قیس کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر عورت مرد کی بدصورتی کے باعث اس کے ساتھ رہنے پر تیار نہ ہو تو محض اتنی سی بات بھی قانونی نقطۂ نظر سے اس کے حق میں فیصلہ صادر کرنے کی موجب بن سکتی ہے۔ عدالت کے لیئے صرف یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ عورت کو شوہر سے اتنی کراہیت پیدا ہو گئی ہے کہ دونوں میں خوشگوار تعلقات کا قیام ممکن نہیں۔ اگر اس کا ثبوت موجود ہو تو اس نفرت و کراہیت کے تفصیلی وجوہ دریافت کرنا ضروری نہیں کیونکہ عورت اپنے شوہر سے بہت سے اسباب کی بنا پر نفرت کر سکتی ہے جن میں سے بعض کو ممکن ہے کہ وہ ظاہر کرنا نہ چاہے۔ البتہ عدالت کو اس بات کا اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ وہ عورت کی نفرت و کراہیت واقعی ہے مصنوعی اور ظاہری نہیں۔

عدالت کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ اس امر کی تحقیق کرے کہ آیا تفریق طلب کرنے والی عورت جنسی لذت کی طالب اور تنوع کی شوقین ہونے کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے یا کسی دوسرے سبب سے عورت کو تفریق اور علیحدگی کا جو حق اسلامی قانون کی رو سے حاصل ہے وہ اس شرط سے مشروط نہیں کہ وہ اسے جنسی آوارگی کا شوق پورا کرنے کے لئے استعمال نہ کرے۔ بلا شبہ مذہبی تعلیم کی اصل روح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی ہدایات کا مقصد یہی ہے کہ طلاق اور تفریق کی سہولتوں کو محض لذت طلبی کے اغراض کے لیے

استعمال نہ کیا جائے ۔لیکن اس اخلاقی تعلیم کا تعلق فرد کی ذات سے ہے۔ قانون کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے کہ آیا ان ہدایات پر کوئی فرد مخصوص عمل کر رہا ہے یا ان کی خلاف ورزی کر رہا ہے ۔علاوہ ازیں اگر کوئی عورت واقعی آوارہ مزاج اور لذت پرست ہو تو محض یہ بات اسے آوارگی اور لذت سے نہیں روک سکتی کہ عدالت اس کے مطالبہ تفریق کو ماننے سے انکار کرتی ہے ۔بلکہ ایسی صورتوں میں عدالت اس کے مطالبہ کو رد کردے تو وہ اس کے لئے آوارگی اور جنسی بدعنوانی کا ایک مزید محرک فراہم کردے گی ۔ اور مذہبی نقطۂ نظر سے طلاق اور تفریق، زوجین ناجائز جنسی تعلقات سے بہرحال بہتر ہیں ۔بہر صورت عدالت کو ایسے حالات میں مرد اور عورت کے نکاح کو فسخ کرنا پڑے گا اور اس کے بعد پھر ان کے درمیان ازدواجی تعلقات اسی وقت قائم ہو سکتے ہیں جب عورت کا دوسرا شوہر نکاح ثانی کے بعد اسے طلاق دے دے۔

عورت کو مطالبہ تفریق پیش کرتے وقت مہر کی کتنی رقم سے دستبردار ہونا پڑے گا۔اس کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شوہر کو اس سے زیادہ رقم کے مطالبہ کا حق نہیں جتنی اس نے بوقت نکاح عورت کو مہر کی صورت میں ادا کی تھی ۔اگر تفریق زوجین کا عمل باہمی رضامندی کے بعد واقع ہو تو رقم کا تعین بھی باہمی تصفیہ سے کیا جائے گا ۔لیکن اگر مقدمہ عدالت میں پیش ہو تو عدالت کو یہ تصفیہ کرنا ہوگا کہ مہر کا کس قدر حصہ نصف یا ثلث یا ربع عورت کو واپس کرنا چاہئے ۔متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت نے شوہر کی بدسلوکی یا زیادتی سے تنگ آکر تفریق کا

دعویٰ کیا تو عدالت عورت کو مہر کی واپسی سے مستثنیٰ کر سکتی ہے یا مہر کی کل رقم سے کم رقم واپس کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس کا دار و مدار مقدمہ کے مخصوص حالات پر ہے۔ بعض فقہا کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر عورت مطالبہ تفریق کے معقول وجوہ نہ رکھتی ہو اور محض جنسی آوارگی کے شوق نے اُسے مطالبہ تفریق پیش کرنے پر آمادہ کیا ہو تو عدالت اسے مہر سے زائد رقم ادا کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔ شوہر کی بدسلوکی اور عورت کی نفرت و کراہیت کے علاوہ اسلام نے تفریق زوجین کے اور اسباب بھی تسلیم کئے ہیں۔ مثلاً خیار بلوغ یعنی کسی نابالغہ لڑکی کا نکاح کر دیا گیا ہو مگر بالغ ہونے کے بعد وہ اس نکاح کو ناپسند کرے۔ اسی طرح عدم ادائی نفقہ، ارتداد، ضعف رجولیت، متعدی امراض کا وجود یا شوہر کی مفقود الخبری۔ تمام امور بھی تفریق کا سبب بن سکتے ہیں۔

نابالغہ لڑکی کے معاملہ میں قرآن نے اس کے ولی اور سرپرست کی رائے کو تھوڑی سی اہمیت دی ہے یعنی ولی یا سرپرست کو یہ حق ضرور پہونچتا ہے کہ وہ اپنی رائے سے نابالغہ کا نکاح کر سکے۔ لیکن قرآن حکیم کی کسی آیت سے یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ بلوغ کے بعد لڑکی کو ایسے نکاح کے رد و قبول کا اختیار نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ عورت کے لئے نکاح کے مسئلے میں ولی یا سرپرست کا مشورہ لینا ضروری ہے لیکن وہ قانوناً اس مشورہ کی پابند نہیں اور اُسے مکمل اختیار ہے، کہ چاہے تو ولی کی رائے پر عمل کرے اور چاہے تو اُس کی رائے کو مسترد کر دے۔ چنانچہ ابوداؤد کی ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے :-

عن ابن عباس قال ان جاریة بکراً اتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ان اباھا زوجھا وھی کارھة فخیرھا النبی صلعم۔

(ابوداؤد)

ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور بیان کیا کہ میرے باپ نے میری شادی کردی ہے، لیکن مجھے یہ شادی ناپسند ہے۔ اس پر حضور نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو نکاح قائم رکھے اور چاہے تو فسخ کردے۔

اسی طرح بخاری کی ایک روایت ہے :۔

عن خنساء بنت خذام ان اباھا زوجھا وھی ثیب فکرھت ذالک فاتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرد نکاحہ وفی روایة ابن ماجه نکاح ابیھا

خنسا بنت خذام کی روایت ہے کہ میرے باپ نے میری دوسری شادی کردی جو مجھے ناپسند تھی۔ میں رسول اللہ کے پاس آئی تو آپ نے نکاح فسخ کردیا۔

دارقطنی میں حضرت جابر کی ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے ایک نکاح کو محض اس لئے فسخ فرمادیا کہ نکاح لڑکی کے خلاف مرضی ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے نکاح کردیا۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے ردکردے۔ اس پر لڑکی نے کہا:

یارسول اللہ اجزت ما صنع ابی و انما اردت ان اعلم النساء ان الی الاباء من الامر شیئ	یارسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اُسے میں نے منظور کیا۔ میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

ان روایات کی روشنی میں یہ امر صاف طور سے ظاہر ہے اگر کسی نابالغہ کا ولی۔ سرپرست یا والد اس کا نکاح اپنی مرضی سے کر دے اور بلوغ کے بعد وہ لڑکی اس نکاح کو ناپسند کرے تو اُسے پورا پورا اختیار ہے کہ چاہے تو اس نکاح کو باقی رکھے اور چاہے اُسے فسخ کر دے۔ اس کے باوجود تعجب یہ ہے کہ ہمارے فقہا نابالغ لڑکیوں کو خیار بلوغ کا حق اسی صورت میں دیتے ہیں جبکہ ان کے والد یا دادا کے سوا اور کسی سرپرست نے ان کا نکاح کیا ہو۔ لیکن اگر کسی نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد یا دادا کی مرضی سے عمل میں آیا ہو تو ہمارے فقہا کے فیصلہ کے مطابق اس لڑکی کو بعد بلوغ فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا بجز اس کے کہ والد یا دادا کے متعلق اس بات کا ثبوت موجود ہو کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں رہا ہے یا وہ طبعاً لاپرواہ اور غیر محتاط ہے اس فقیہانہ فیصلہ کے لئے حقیقتاً قرآن یا حدیث میں کوئی سند موجود نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقہانے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا ہے کہ والد یا دادا بہر صورت لڑکی کا خیر خواہ ہوگا اور اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہو سکتا جو لڑکی کے مفاد کے منافی ہو۔ یا جس سے اس کے مستقبل پر بُرا اثر پڑے۔ حالانکہ یہ مفروضہ حسب ذیل وجوہ

سے غلط ہے :-

اولاً احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہمزہ کی لڑکی کا نکاح عمر ابن ابی سلمہ سے کر دیا تھا جب کہ لڑکی ابھی نابالغ تھی نیز بوقت نکاح آپ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ بلوغ کے بعد لڑکی کو اختیار ہو گا کہ وہ چاہے تو نکاح کو مسترد کر دے یہاں آپ نے خیار بلوغ کے معاملہ میں باپ یا دادا کے فیصلے کو مستثنیٰ نہیں فرمایا۔ اگر باپ یا دادا اس قانون سے مستثنیٰ ہوتے تو آپ بہ تصریح فرما دیتے کہ میں چونکہ اس لڑکی کا باپ نہیں ہوں اس لئے میرے فعل سے لڑکی پر یہ پابندی لازم نہیں آتی کہ وہ بہرصورت اس نکاح کو قائم رکھے خواہ وہ اُسے پسند کرے یا نہ کرے۔ نیز اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خیار بلوغ کے مسئلہ میں والد، دادا یا سرپرست کی خیر خواہی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اہل اُمت کا خیر خواہ کون ہو گا۔ آپ نے جس لڑکی کا نکاح فرمایا وہ نہ صرف آپ کی اُمتی بلکہ آپ کے حقیقی چچا کی لڑکی تھی۔ اس لئے آپ نے جو کچھ کیا اس کی خیر خواہی اور بہبودی کے لئے کیا۔ آپ کے اس عمل میں بدخواہی کا ادنیٰ سا بھی شائبہ نہ تھا۔ اس کے باوجود جب آپ نے اس کو فسخ نکاح کا اختیار دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ والد، دادا، یا سرپرست کی خیر خواہی بدخواہی یا بے پرواہی لڑکیوں کے اس حق پر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں اگر فقہا کا یہ فیصلہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ باپ یا دادا نابالغہ کے مفاد کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتا تو اس کا اطلاق بالغ اور نابالغ لڑکیوں پر یکساں ہونا چاہئے۔ نابالغہ عورتوں کے ساتھ اس مفروضہ کو مخصوص

کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔پھر یہ مفروضہ یوں بھی غلط ہے کیونکہ ایسی
کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں نابالغ لڑکیوں کے والدین یا دادا وغیرہ
نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر لڑکیوں کے مستقبل کی پرواہ نہیں کی ۔
مزید برآں اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ماں باپ یا دادا لڑکی کے نکاح
اور شوہر کے انتخاب میں تمام ضروری امور کو ملحوظ رکھیں گے تب بھی
یہ ناممکن نہیں کہ نکاح کے کچھ عرصہ بعد شوہر نالائق ثابت ہو یا وہ ایسے
اوضاع و اطوار اختیار کرے جو لڑکی کے لئے مضرت رساں ثابت ہوں
یا لڑکی اور اس کے شوہر کے درمیان اختلاف طبیعت یا دیگر اسباب
کی بنا پر ناچاقی پیدا ہو جائے ۔ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے
کہ ہمارے فقہا کا مسلک اس بارے میں احکام اسلام اور قرآنی
اصولوں کے مطابق نہیں ۔پھر چونکہ اس مسلک کی تائید میں قرآن
اور حدیث کی بھی کوئی سند نہیں پیش کی جا سکتی اس لئے موجودہ دور
کی مسلم حکومتیں فقہا کے اس فیصلہ اور رائے کی پابند نہیں ہو سکتیں

اگر شوہر اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے سے انکار کرے تو
عدالت دو طریق ہائے کار میں سے ایک اختیار کر سکتی ہے ۔اگر شوہر نے
حالات سے مجبور ہو کر ایسا نہ کیا ہو بلکہ نان و نفقہ مہیا کرنے پر قادر
ہو تو عدالت اسے قانون کی طاقت سے بیوی بچوں کی معاشی کفالت
پر مجبور کر سکتی ہے ۔ پھر بھی شوہر انکار کرے تو عدالت تفریق زوجین
کا حکم دے سکتی ہے ۔اور ایسی صورت میں نکاح فی الفور فسخ ہو جائیگا۔
البتہ اگر شوہر واقعتاً بیوی کی معاشی کفالت سے معذور ہے تو امام احمد
ابن حنبل کی رائے کے مطابق نکاح فوراً فسخ کر دینا پڑے گا ۔امام

شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ایسی صورت میں شوہر کو تین روز کی مہلت دی جانی چاہئے اور امام مالک کے مذہب کے لحاظ سے اسے دو یا تین ماہ کا موقعہ ملنا چاہئے۔

زوجین میں سے کسی ایک کے مرتد ہو جانے سے نکاح خود بخود فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی قانون کی رو سے کوئی مسلمان عورت غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی ہے۔ اس طرح مسلمان مردوں کو بھی مشرکوں اور کافروں کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ البتہ جب کہ تبدیل مذہب کرنے والی عورت عیسائی یا یہودی مذہب اختیار کرے تو نکاح فسخ نہیں ہوگا کیونکہ اسلام نے مسلمان مردوں کو اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے

اگر شوہر نامرد ہو تو بیوی عدالت سے تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے لیکن مرض کے قابل علاج ہونے کی صورت میں شوہر کو ایک سال کا موقعہ دیا جائے گا تاکہ وہ اپنا علاج کروا سکے۔ پیدائشی نامرد ہونے کی صورت میں نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی فقہاء نے ایسی صورتوں میں حسب ذیل شرائط بھی مقرر کی ہیں جن کے لئے عقلاً اور از روئے حکمت و مصلحت وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے۔

اولاً اگر بیوی کو نکاح سے قبل شوہر کی نامردی کا علم تھا لیکن اس کے باوجود وہ نکاح پر راضی ہوگئی تو نکاح فسخ نہیں ہو سکیگا

دوئم اگر بیوی نکاح سے قبل شوہر کی نامردی سے واقف نہ تھی لیکن نکاح کے بعد جب اُسے علم ہو گیا کہ اس کا شوہر نامرد ہے تب بھی وہ نکاح باقی رکھنے پر راضی رہی تو بعد میں وہ تفریق کا

مطالبہ نہیں کر سکے گی۔

سویم اگر نامرد شوہر علاج کے بعد ایک مرتبہ بھی مباشرت پر قادر ہو جائے تو عورت کو فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق باقی نہیں رہتا۔

یہ تینوں شرطیں منافی عقل اور خلاف حکمت ہیں اور ان سے اسلامی قانون ازدواج کے اصل منشا کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اسلامی اصولوں کی رو سے ازدواج کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ خاندانی نظم مستحکم رہے اور زوجین ناجائز جنسی تعلقات کی آلودگی سے پاک رہیں اگر ہمارے فقہا کے مقرر کردہ شرائط کی پابندی کی جائے تو نہ صرف نظم خاندانی پارہ پارہ ہو جائے گا بلکہ عورتیں اپنے فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر جنسی بدعنوانیوں اور اخلاق فاسدہ میں مبتلا ہو جائیں گی اگر کوئی عورت بے عقلی یا حماقت سے کسی ایسے مرد سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے جس کی جسمانی کمزوریوں کا اسے پہلے سے علم ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تجربہ کے بعد وہ اپنی غلطی محسوس کرے اور ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناپسند کرے۔ ایک اجتہادی غلطی یا احمقانہ فعل کی سزا اتنی سخت تو نہیں ہو سکتی کہ عورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مصیبت اور تکلیف کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ علیحدگی کی صورت میں جب اُسے مہر سے دست بردار ہونا پڑتا ہے تو یہ مالی نقصان اُس کی کافی سزا ہے۔ بالکل یہی بات ان عورتوں کے لئے بھی صحیح ہے جنھیں شادی سے قبل اپنے شوہر کے جسمانی عیوب کا حال نہیں معلوم ہوتا لیکن جب انھیں فریق ثانی کی اصل حالت کا علم ہو جاتا ہے تب بھی وہ بہ تقاضائے شرافت فسخ نکاح پر اصرار نہیں کرتیں۔

اور وضعداری کے خیال سے اُن کی زوجیت منظور کر لیتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایسی بیویاں بھی تجربہ کے بعد علیحدگی کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو جائیں اور کچھ عرصہ کے بعد وہ یہ محسوس کریں کہ اُن کے جذبات کی عدم تسکین اب ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی عورت اس نتیجہ پر پہونچے کہ قید نکاح سے آزادی نہ ملنے کی صورت میں اس کے جذبات بے قابو ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ خواہشات کے غلبہ سے مجبور ہو کر وہ آلودہ معصیت ہو جائے تو اسے تفریق کا مطالبہ کرنے کی پوری پوری آزادی ملنی چاہیئے۔ محض اس بنا پر اس کے مطالبہ آزادی کو رد کر دینا کہ پہلے وہ اسی شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادگی ظاہر کر چکی ہے۔ درحقیقت اس کو آغوش گناہ میں دھکیلنا ہے۔ نکاح اور شادی کا مقصد تو یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی عفت و پاکدامنی خطرہ میں نہ پڑے اور وہ آسانی کے ساتھ پاکبازی کی زندگی بسر کریں نہ یہ کہ اُن کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن میں وہ اپنے ایمان و ضمیر اور احساس شرافت کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

متعدی امراض کی صورت میں عورت کو تفریق کا مطالبہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے یا نہیں اس بارے میں ہمارے قدیم فقہا کے تین مختلف مسلک ہیں۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا مذہب یہ ہے کہ جنون جذام، برص اور اسی نوع کے دیگر امراض کی صورت میں میاں بیوی میں سے کسی کو بھی مطالبہ تفریق کا حق نہیں۔ دوسرے گروہ

کی رائے یہ ہے کہ ایسے تمام امراض میں جن سے مردوں عورتوں کے جنسی تعلقات منقطع ہوجائیں۔ مثلاً جنون، برص، گندہ دہنی۔ امراض خبیثہ اور شرمگاہ کے ایسے عیوب جو ترک مباشرت پر مجبور کریں۔ مرد اور عورت دونوں کو علیحدگی کا حق ہے۔ فقہا میں سے امام مالک کی رائے یہی ہے۔ امام شافعی کے مسلک کی رو سے جنون، جذام اور برص میں عورتوں اور مردوں کو علیحدگی کا مطالبہ کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن قروح سیالہ فرج مثلاً آتشک وغیرہ اور گندہ دہنی اور خارش کی صورت میں زوجین میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ علیحدگی کا مطالبہ کرے۔ البتہ اگر اندام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں یا شوہر عنین ہو تو ایسی صورت میں عورت کو مطالبہ تفریق کی کامل آزادی ہے۔ امام محمد کے نزدیک شوہر عورت کے کسی عیب کی بنا پر تفریق کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ مگر عورت شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے ان میں سے حضرت امام مالک کا مسلک زیادہ صحیح اور قرآنی اصولوں سے قریب تر ہے۔ قرآن کے بیانات اور توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں دو اخلاقی عناصر خاص طور پر ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

۔ اولاً مردوں اور عورتوں کی عفت و پاکیزگی کا تحفظ، دوئم زوجین کے درمیان مودت و رحمت کے تعلقات کا قیام اگر عورتوں اور مردوں کی جسمانی خرابیوں کے باعث زوجین میں سے کسی کی زندگی تلخ ہوجائے تو یہ دونوں عناصر ناپید ہوجاتے ہیں اور نکاح کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر امام شافعی

یا امام ابوحنیفہ کا مسلک اختیار کیا جائے تو اس سے منشاء نکاح پورا نہیں ہوتا اور قرآن کے وضع کردہ اصولوں کی نفی ہوتی ہے۔ جہاں اس بات کا خفیف ترین اندیشہ بھی موجود ہو کہ زوجین کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری بالآخر ان میں سے کسی ایک یا دونوں کو ارتکاب معصیت پر آمادہ کردیگی وہاں بہتر یہی ہے کہ اُن کے درمیان تفریق کرادی جائے

شوہر لاپتہ ہو جائے تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بڑے وسیع اختلافات ہیں۔ قرآن اور احادیث میں اس کی بابت کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر اور حضرت عبداللہ ابن عباس کا مسلک یہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی مفقود الخبری کی صورت میں چار سال انتظار کرنا چاہئے۔ دوسری طرف ابن مسعود اور حضرتِ علی کی رائے یہ ہے کہ عورت کو شوہر کی واپسی تک یا اتنی مدت تک انتظار کرنا چاہئے کہ اس کی موت کا واقعہ متحقق ہو جائے۔ فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے

یہ دونوں مسلک عورتوں کے ساتھ انصاف اور عدل و احسان کی بنیادی تعلیم کے منافی ہیں اور اُن پر عمل کرنے سے صنف نازک پر صریح ظلم لازم آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ مسلک اختیار کیا اُن کی طبیعت میں احتیاط کی صفت مبالغہ آمیز حد تک پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے عورتوں کے جذبات اور اُن کی نفسیاتی کیفیات کو تقاضائے احتیاط پر قربان کردیا۔ نیز یہ مسلک قرآن کے وضع کردہ اصولوں کے بھی منافی ہے۔ مثلاً قرآن نے مشروط طور پر

تعداد ازدواج کی اجازت دیتے ہوئے کہا تھا :۔

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ

(سورہ نساء)

اور تم میں یہ قدرت نہیں کہ تم عورتوں کے ساتھ عدل کر سکو خواہ کتنا ہی چاہو، بس بالکل ایک کی طرف جھک بھی نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ دوسری کو لٹکا رکھو۔

اسی طرح اُن مردوں کو ہدایت دیتے ہوئے جو بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ قرآن نے فرمایا تھا :۔

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او سرحوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ

(سورہ بقر)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہونچنے لگیں تو یا تو انھیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دو اور اُن کو دُکھ دینے کے لئے روک نہ رکھو تاکہ تم زیادتی کرو اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے

ایلا کے مسئلے میں قرآن کا حکم ہے :۔

للذین یؤلون من نساءھم تربص اربعۃ اشھر فان فاؤ فان اللہ غفور رحیم

اُن لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں کے حق نہ دینے کی قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ

بخشنے والا اور رحم کرنیوالاہے

اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن عورتوں کو چار ماہ سے زیادہ مدت صبر و انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتا ۔ چنانچہ اگر شوہر چار ماہ کے بعد بھی قسم نہ توڑے اور ترک مباشرت پر مصر رہے تو بیوی کو حق ہوجاتا ہے کہ وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کرے ۔ اس طرح مندرجہ بالا تین آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن اس امر کو ظلم اور تعدی میں داخل سمجھتا ہے کہ کوئی شوہر ایک غیر معین مدت تک اپنی بیوی کو لٹکائے رکھے نہ تو اس کو طلاق دے اور نہ اس سے جنسی تعلقات قائم کرے ۔ پھر اگر قرآن نے یہ اصول وضع کر دیا ہے کہ مرد اپنی بیویوں کو ایک محدود مدت سے زیادہ معلق نہ رکھیں تو یہ بات اصول قرآن کے مطابق کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ شوہر کے لاپتہ یا مفقود الخبر ہونے کی حالت میں اس کی بیوی کو مجبور کیا جائے کہ تم اس کی واپسی تک یا اس وقت تک ٹھہری رہو یا جب تک کہ اس کی موت کا وقوع ثابت نہ ہوجائے ۔ اتنی طویل مدت تک کوئی عورت اپنے جذبات نفس اور خواہشات جنسی کو قابو میں نہیں رکھ سکتی ۔ ایسی صورت میں یہ مسلک کس قدر منافی فطرت انسانی اور قرآنی اصولوں سے معارض ہے کہ عورت شوہر کی واپسی تک نکاح ثانی نہ کرے خواہ اس کی واپسی میں دس سال لگ جائیں ۔

حضرت عمر کے ایک فیصلہ سے بھی جو عورتوں سے متعلق تھا اس معاملہ پر گہری روشنی پڑتی ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز رات کو حضرت عمر حسب معمول پہرا دے رہے تھے کہ ایک خیمہ سے کسی عورت کے گانے کی آواز آئی ۔ قریب پہونچ کر آپ نے غور سے سُنا تو عورت یہ اشعار

پڑھ رہی تھی ۔

تطاول ھذ االیل واسود جانبہ وارقنی اذا لا خلیل الاعبہ

رات درازہے اور اس کے اطراف و جوانب سیاہ ہو گئے ہیں میری نیند اُڑ گئی ہے کیونکہ میرا دوست موجود نہیں جو میرے ساتھ خوش فعلیاں کرے ۔

فو اللہ لولا اللہ لا رب غیرہ لزحزح عن ھذ السریر جوانبہ

خدا کی قسم اگر اللہ نہ ہوتا تو اس چارپائی کی چولیں ہل رہی ہوتیں

ولکن ربی والحیاء یکفنی واکرم بعلی ان تو طامراکبہ

میرا رب اور میری حیا مجھے مانع ہیں اور میں اپنے شوہر کا احترام کرتی ہوں کہ اس کے حقوق پر دست درازی نہ کی جائے ۔

حضرت عمر نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا شوہر جہاد پر گیا ہوا ہے ۔ آپ گھر واپس آئے اور حضرت حفصہ سے دریافت کیا کہ ایک عورت کتنے دنوں کی جدائی برداشت کر سکتی ہے ۔ اُنھوں نے بڑے پس و پیش کے بعد فرمایا چھ ماہ سے زیادہ کی جُدائی عورت کے لئے ناقابل برداشت ہے ۔ اس کے بعد حضرت عمر نے حکم دیا کہ ہر مسلمان سپاہی کو چھ ماہ کے بعد کچھ دنوں گھر آنے کے لئے رخصت دی جایا کرے جب یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ عورت چھ ماہ سے زیادہ اپنے شوہر سے جدا نہیں رہ سکتی بجز اس کے کہ یہ جدائی ناقابل برداشت ہو جائے تو پھر

یہ فیصلہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مفقود الخبر کی عورت کو اس کی واپسی تک انتظار کرنا چاہیئے یا اس وقت تک جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ مرچکا ہے۔ اس قسم کے فیصلہ کا اثر اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ عورت معصیت فاحشہ پر آمادہ ہو جائے۔

غالباً انھیں وجوہ کے پیش نظر حنفیوں اور شوافع نے بھی اس مسئلہ میں امام مالک کا مسلک اختیار کر لیا ہے کیونکہ امام مالک کا مسلک عدل وانصاف کے مقتضیات اور قرآن کے وضع کردہ اصولوں سے قریب تر ہے۔ لیکن امام مالک نے مفقود الخبری کی صورت میں تین مختلف حالتوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر حالت کے لئے ایک مخصوص حکم دیا ہے۔

اول۔ اگر مفقود الخبر شوہر نے کچھ مال یا جائداد نہیں چھوڑی ہے جس سے عورت اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کر سکے تو عدالت فوراً فسخ نکاح کا حکم دیکر عورت کو نکاح ثانی کے لئے آزاد کر دے گی شافعی اور حنبلی مذاہب بھی امام مالک کی اس رائے سے متفق ہیں کیونکہ اُن کے مذہب کے لحاظ سے مرد کا عورت کو نان ونفقہ ادا نہ کرنا ہی فسخ نکاح کی کافی اور معقول وجہ ہے۔

دوئم۔ شوہر نے مال یا جائداد تو چھوڑی ہے لیکن بیوی بالکل نوجوان ہے اور اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کر سکے گی۔ ایسی صورت میں عدالت ایک سال چھ ماہ یا اس سے کم مدت مقرر کر سکتی ہے جس میں وہ شوہر کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ اگر شوہر اس مدت میں واپس نہ ہو تو نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت

دوسرا نکاح کر سکے گی۔ اگر عدالت ضروری سمجھے تو وہ فی الفور بھی نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ نیز عدالت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت سے صراحتاً یہ اقرار کروائے کہ وہ بغیر شوہر کے نہیں رہ سکتی۔ اس کا فیصلہ خود عدالت کو کرنا چاہئے۔

سوئم۔ شوہر نے مال تو چھوڑا ہے لیکن بیوی بغیر شوہر کے بھی رہ سکتی ہے اور اس کے مبتلائے معصیت ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ایسی صورت میں تین مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

(الف) اگر شوہر بلاد اسلام میں یا ایسے ممالک میں لاپتہ ہوا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے تو اُس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

(ب) اگر وہ میدان جنگ میں لاپتہ ہوا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

(ج) اگر وہ کسی مقامی فساد کے سلسلہ میں کھو یا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اس کی تلاش کے لئے امکانی کوشش کی جائیگی پھر لیا انتظار اس کی بیوی کو عدت وفات گزارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

(د) اگر وہ غیر مہذب ممالک میں گم ہو گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں اور جہاں اس کو تلاش کرنا بھی ممکن نہیں تو اس کی بیوی کو (۷۰) یا (۸۰) سال انتظار کرنا پڑیگا لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب عورت کی معاشی کفالت کا

کوئی انتظام ہو اور اس کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو

احکام مندرجہ بالا سے یہ امر صاف طور پر ظاہر ہے کہ مالکی فقہ بھی جو دوسرے مذاہب فقہ سے معقول تر ہے عورت کی مدت انتظار معین کرنے میں فطرت انسانی کے جذبات و خواہشات کا پورا پورا لحاظ نہیں کرتی۔ کسی عورت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ستر بہتر سال تک شوہر کی واپسی کا انتظار کرے دراصل اسے مدت العمر کے لئے تجرد پر مجبور کر دینے کے مترادف ہے اور یہ عمل نہ صرف معقولیت پر مبنی نہیں بلکہ فطرت انسانی کے بالکل خلاف اور نکاح کی حکمتوں اور مصلحتوں کے یکسر منافی ہے۔ حضرت عمر کے زمانہ میں جب یہ اصول طے ہو گیا کہ مجاہدین کی بیویاں چھ ماہ سے زائد تنہا نہ رہیں تو اسی اصول کا اطلاق مفقود الخبر شوہر کی بیوی پر بھی ہونا چاہیے۔

مفقود الخبر کی واپسی کے بعد خواہ یہ واپسی تلاش کے بعد عمل میں آئے یا بلا تلاش عورت اس کے نکاح میں آئے گی یا نہیں اس مسئلہ میں صحابہ کرام اور فقہا کی رائیں مختلف ہیں۔ حضرت عمر کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت کا نکاح ثانی نہیں ہوا ہے تو وہ مفقود الخبر شوہر کی زوجیت میں آئے گی۔ لیکن اگر اس کی شادی ہو چکی ہے تو مفقود الخبر یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ وہ اس کی بیوی ہے خواہ دوسرے شوہر سے اس کے جنسی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں۔ امام مالک نے حضرت عمر کی اسی رائے پر عمل کیا ہے۔ حضرت علی کی رائے اس کے برعکس یہ ہے کہ پہلے شوہر کی واپسی کے بعد عورت اسی کو ملے گی خواہ وہ دوسری شادی کر چکی ہو اور نکاح ثانی کے بعد اس کی اولاد بھی ہو

احناف نے اس رائے کے مطابق عمل کیا ہے۔ حضرت عثمان کا مسلک یہ ہے کہ پہلے شوہر کو حق ہوگا کہ چاہے تو وہ عورت کو واپس لے لے اور چاہے تو اسے چھوڑ دے اور اپنا ادا کردہ مہر واپس لے لے۔ اگر وہ اپنا مہر واپس لے لے یا عورت سے مہر کی واپسی کا مطالبہ کرنے سے دست بردار ہو جائے تو عورت دوسرے شوہر کے نکاح میں رہ سکتی ہے بہ صورت دیگر عورت کو دوسرے شوہر سے علیحدہ ہو کر چار ماہ کی عدت گزارنی ہوگی۔ اس مدت کے بعد وہ پہلے شوہر کی زوجیت میں آ جائیگی علاوہ ازیں دوسرے شوہر سے اپنا مہر بھی وصول کر سکے گی۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے بہ تفصیل اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اسلام نے طلاق اور علیحدگی کے بارے میں عورتوں کو کیا حقوق دئے ہیں۔ اس توضیح سے معلوم ہوگا کہ اور معاملات کی طرح اس خصوص میں بھی اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کامل مساوات قائم کی ہے اس میں شک نہیں کہ مردوں کو طلاق کی جو آسانی ہے وہ عورتوں کو نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں عورتوں کو عدالت سے رجوع کرنے کا جو حکم ہے اس سے ان کی آزادی کو محدود کرنا مقصود نہیں بلکہ اُن کے حقوق کی مؤثر حفاظت مقصود ہے۔ عورت اگر اپنے شوہر سے پیچھا چھڑانا چاہے تو اپنے مطالبہ تفریق کے لئے اتنے وجوہ پیدا کر سکتی ہے کہ عدالت کو کسی نہ کسی بنا پر اس کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہمارے یہاں عورتوں کو علیحدگی حاصل کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن کی وجہ یہ نہیں کہ اسلام نے ان کے لئے دقتیں پیدا کی ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب یہ

ہے کہ ایک تو عورتوں کو اُن کے حقوق سے بالکل لاعلم رکھا گیا ہے۔ اس لئے وہ جہالت اور کم علمی کی وجہ سے قانون کی رخصتوں اور آسانیوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتیں۔ دوئم مروجہ پردہ نے انھیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ . . . . وہ باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں پیدا کر سکتیں اور نہ آزادی کے ساتھ ضروری معاملات میں دوسرے مردوں سے بات چیت کر سکتی ہیں۔ ان کے اندر اپنے حقوق کی حفاظت کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے اور ہمت و جرات مفقود ہو چکی ہے اس لئے وہ مردوں کے مظالم کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہیں۔ ایک تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں عورت معاشی حیثیت سے مردوں کی اتنی دست نگر ہے کہ وہ مردوں کے مظالم کے خلاف اپنے حقوق کا اثبات کرنے سے ڈرتی ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وسائل رزق سے محروم ہو کر معاشی کلفت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر عورتوں کو تمام حقوق جو اسلام نے دئے ہیں قانون اور حکومت کی طرف سے دلوا دئے جائیں تو بھی اس کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔ تا وقتیکہ اسے موجودہ رواجی پردہ کی قید سے نہ آزاد کیا جائے اور معاشی اعتبار سے پورے طور پر نہ سہی تو کسی حد تک وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائے۔

پردہ

پردہ کے موضوع پر مسلمانوں کے قدامت پسند طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے "روشن خیال" طبقہ میں جس نے یورپی تہذیب و تمدن کو معیار حق قرار دیا ہے۔ عرصہ دراز سے بڑی گرما گرم بحث جاری ہے۔ عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلم مفکروں، مورخوں اور نقادوں نے بھی پردہ پر بحث کرتے ہوئے اسلام کے خلاف بہت کچھ زہر افشانی کی ہے۔ ہمارا قدامت پسند طبقہ جس کا اثر سوسائٹی میں اب بھی بہت وسیع ہے مروجہ پردہ کا نہ صرف حامی ہے بلکہ اُس کو اسلامی طریق زندگی اور طرز تمدن کا ایک ضروری اور لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ کا استدلال یہ ہے کہ پردہ کا مروجہ طریقہ ابتدائے اسلام سے رائج ہے اور یہ اس زمانہ کی پیداوار نہیں جب مسلمان غیر اسلامی اثرات سے متاثر ہو چکے تھے اس کے برخلاف "روشن خیال" مسلمان جو یورپ کے افکار و اعمال کو اپنے لئے دلیل راہ خیال کرتے ہیں۔ پردہ کے موضوع پر اس انداز سے بحث کرتے ہیں گویا کہ سینما اسٹیج پر امریکی اور انگریزی فلموں میں زندگی کا جو نقشہ دکھایا جاتا ہے اور یورپ و امریکہ کے عشرت پسند حلقوں نے زندگی کا جو ڈھنگ اختیار کیا ہے ابتدائے عہد میں اسلام مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت کا ڈھنگ بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا کہ اکثر صورتوں میں تجربہ کیا گیا ہے یہ دونوں مکاتیب خیال انتہا پسندی میں مبتلا ہیں اور اصلی حقیقت ان دونوں انتہاؤں کے وسط میں ملے گی۔

اس امر سے انکار کرنا دشوار ہے کہ زمانہ حال میں مسلمانوں کے متوسط طبقات کی عورتیں جس قسم کا پردہ کرتی ہیں اس کا اسلام اور اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ۔ پردہ کا موجودہ طرز وطریق ایک غیر مذہبی رسم ہے جس کو مسلمانوں نے ابتدائے اسلام کی کئی صدیوں کے بعد بعض سیاسی اور معاشرتی حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر اختیار کیا ۔ ابتدائے اسلام میں عربوں کی زندگی کا نقشہ کچھ اور تھا ۔ تاریخ اور احادیث و آثار سے یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں مسلمانوں نے اپنی عورتوں پر ایسی سخت پابندیاں لگائی تھیں یا انھیں مذہبی ، معاشی اور تمدنی فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں باہر نکلنے سے روکتے تھے ۔ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں بالکل مقید رکھنے کا رواج نہ تو قبل از اسلام عربوں میں پایا جاتا تھا اور نہ اسلام کے ابتدائی عہد میں ۔ اسی طرح تاریخ اور احادیث و آثار سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خاندان رسالت ، صحابہ کرام یا دوسرے مسلمانوں کی عورتیں اس بے باکی اور بے پردگی کے ساتھ باہر نکلتی تھیں جس طرح یورپ اور امریکہ کی عورتیں یا ہمارے "روشن خیال" طبقہ کی عورتیں سیر و تفریح اور عیش و نشاط کے لئے نہایت آزادی اور بے حجابی سے باہر آتی جاتی ہیں ۔ مردوں اور عورتوں کا مشترکہ محفلوں میں جمع ہو کر باہم آزادی سے گفتگو اور ہنسی مذاق کرنا یا مل جل کر سیر و تفریح کے لئے جانا اسلامی تاریخ کے کسی ایک واقعہ سے بھی ثابت نہیں ۔ البتہ ملوکیت کے دور میں خلفاء بنو امیہ یا خلفائے عباسیہ اور ان کے امراء کی زندگی میں اگر اس قسم کے چند واقعات ملتے ہیں تو ان کا شمار مستثنیات میں ہے ۔ لیکن ان

عشرت پسند اور لذت پرست مسلمانوں کو بھی کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ علانیہ اس قسم کی حرکات کا ارتکاب کریں۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے محلوں کی چار دیواری میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں عورتیں اپنے خانگی کاموں یا مذہبی اور تمدنی ضروریات کے لئے بلا روک ٹوک گھروں سے باہر نکلتی تھیں لیکن جب وہ باہر آتیں اور مذہبی یا سیاسی امور میں حصہ لیتیں تو اُن کے لباس اور رفتار و گفتار سے کبھی بے حجابی کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ وہ اس طرح بن سنور کر باہر آتی تھیں کہ مردوں کی نگاہیں خواہ مخواہ اُن کی طرف اُٹھنے لگیں۔ اس کے علاوہ وہ مردوں کی سوسائٹی سے بالکل الگ رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ نماز باجماعت ادا کرتے وقت بھی بھائی بہن کے ساتھ یا بیٹا ماں کے پہلو میں نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔ بلکہ عورتوں کی صفیں سب سے پیچھے ہوا کرتی تھیں۔ بلا ضرورت مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط اور میل جول کی اسلام نے کبھی اجازت نہیں دی اور یہ طریقہ اسلامی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں صورتوں میں فرق کرنا ضروری ہے ورنہ پریشان خیالی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ بحث کہ آیا عورتوں کو باہر جاتے ہوئے برقعہ یا نقاب کا استعمال کرنا چاہیے یا وہ چہرہ کھول کر باہر جا سکتی ہیں۔ خانگی محفلوں، سرکاری تقاریب اور سیاسی مجالس میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے جائز ہونے یا نہ ہونے کی بحث بالکل جدا ہے۔ جہاں تک پچھلے سوال کا تعلق ہے ہم روشن خیال حضرات سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن دوسرے مسئلہ میں ہمیں اُن سے شدید اختلاف ہے۔ اور ہم صرف معاشرتی فرائض کے

سلسلہ میں مردوں عورتوں کے اختلاط کو روا سمجھتے ہیں جہاں تک کہ ایسا اختلاط ناگزیر ہو ۔

مروجہ پردہ کے حامی جن کے یہاں عورتیں قیدیوں کی طرح گھروں میں محصور رہتی ہیں حسب ذیل قرآنی آیات پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں :۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ انما یرید لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (احزاب)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جاہلیت کی زینت و نمائش کو ترک کردو نماز قائم کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو ۔ اللہ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری ناپاکی کو دور کرے اور تمہیں پاک وصاف بنائے ۔

یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین

اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں نزدیک کرلیں ۔ یہ بہت بہتر ہے تاکہ وہ پہچانی نہ جائیں اور انہیں ایذا نہ دی جائے ۔

وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن

اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت

الا ما ظهر منها (النور) — کریں اور اپنی زینت و آرایش کو ظاہر نہ کریں مگر وہ جو ظاہر ہو جائے۔

مروجہ پردہ کے حامی پہلی آیت کے یہ معنی لیتے ہیں کہ اسلام عورتوں کو گھروں کی چاردیواری میں بالکل بند رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ تعبیر صحیح نہیں۔ قرآن جب یہ کہتا ہے کہ عورتوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرنا چاہیے اور اپنی زینت و آرائش کی علانیہ نمائش سے باز رہنا چاہیے تو وہ جاہلیت کے طور طریقوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جبکہ عورتیں تمام قانونی حقوق سے محروم ہونے اور معاشرتی حیثیت سے نہایت ادنیٰ مرتبہ رکھنے کے باوجود بڑی بے حجابی اور بے باکی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی نمائش کرتی پھرتی تھیں اور انھیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور انھیں پرورش و پرداخت کی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ قرآن اس طریق زندگی کو تبدیل کر کے عورتوں میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھر کی ذمہ داریوں سے غفلت نہ برتیں اور گھر ہی کو اپنے مشاغل اور دلچسپیوں کا مرکز بنائیں۔ گھر میں ٹھہرے رہنے کی تاکید اور حسن و جمال اور زینت و آرائش کے علانیہ اظہار کی ممانعت بلاکسی وجہ کے یکجا نہیں ملتی۔ ان دو مختلف احکام کا ایک ہی آیت میں پایا جانا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ جو عورتیں گھر سے باہر اپنے حسن و جمال اور زیب و زینت کی نمائش کرتی پھرتی ہیں، ان کے اندر نہ تو گھریلو ذمہ داریوں اور معاشرتی فرائض کا احساس پایا جا سکتا ہے اور نہ اپنی عصمت و عفت

کے تحفظ کا خیال جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی عورتیں اخلاقی حیثیت سے بھی گری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں نہ تو بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کے فرائض ٹھیک طور پر انجام دے سکتی ہیں اور نہ شوہروں کے ساتھ ان کے اندر کوئی اُلفت و وابستگی پائی جا سکتی ہے۔ جو عورت اپنے گھریلو فرائض معاشرتی ذمہ داریوں اور اپنی عصمت و عزت کے تحفظ کو ضروری سمجھتی ہو اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ بلا ضرورت اور بلا موقعہ گھر سے باہر آوارہ گردی کرتی رہے۔ بس قرآن کا مطالبہ اسی قدر ہے کہ بغیر کسی جائز ضرورت کے خواہ وہ معاشی ہو سیاسی ہو یا تمدنی گھروں سے باہر نہ آؤ اور جب ضروریات کی تکمیل کے لئے باہر نکلو تو اپنے حسن و جمال کو مخفی رکھنے کی کوشش کرو۔ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خواہ کیسی ہی شدید ضرورت لاحق ہو، معاشی حاجتوں، سیاسی مصالح اور مذہبی فرائض کے تقاضے کتنے ہی دامنگیر ہوں مگر عورتوں کو گھر سے باہر قدم نہ رکھنا چاہئے۔ ہمارے اس استدلال کی تائید حسب ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف و صریح الفاظ میں عورتوں کو ان کی ضروریات کے سلسلہ میں باہر آنے کی اجازت دی:۔

عن عائشہ قالت خرجت سودہ بعد ماضرب الحجاب لحاجتها وكانت امرأة جسيمة لاتخفى على من يعرفها فرآها عمر بن الخطاب فقال يا سودة اما والله	حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ حضرت سودہ پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ایک رات قضائے حاجت کے لئے گھر سے نکلیں چونکہ وہ ایک جسیم عورت تھیں اس لئے عمر نے اُن کو پہچان کر آواز دی

ما تخفين علينا فانظری کیف تخرجين قالت فانكفأت راجعة ورسول الله صلی الله علیه وسلم فی بیتی وانه لیتعشیٰ وفی یده عرق فدخلت فقالت یارسول الله انی خرجت لبعض حاجتی فقال لی عمر کذا وکذا قالت فاوحی الله الیه ثم دفع عنه وان العرق لفی یده ما وضعه فقال انه قد اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن

(ابن کثیر صفحہ ۱۱ جزو ۸)

سودہ تم ہم سے کیسے چھپ سکتی ہو، ہم بھی دیکھیں تم کیسے باہر نکلتی ہو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ سُنکر سودہ اُلٹے پاؤں واپس آگئیں۔ حضور میرے گھر میں شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ہڈی آپ کے ہاتھ میں تھی کہ اتنے میں سودہ آئیں اور کہا حضور میں قضائے حاجت کے لئے باہر گئی تھی کہ عمر نے اتنی باتیں کیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اتنے میں آپ پر وحی نازل ہوئی پھر وحی کی حالت دور ہوئی ہڈی ابھی آپ کے دست مبارک میں تھی۔ آپ نے فرمایا تمہیں اجازت دیدی ہے کہ ضروریات کے لئے تم گھر سے باہر نکل سکتی ہو۔

ہمارے اس استدلال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ پردہ کی آیت کے نزول کے بعد خود خاندان رسالت کی خواتین حج کرنے کے لئے گھروں سے باہر نکلتی تھیں۔ حج کے دوران میں طواف بھی کرتی تھیں اور صحابہ کرام ان سے احادیث بھی سنتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر روح المعانی میں لکھتے ہیں:۔

فقد كن بعد النبي صلى الله عليه وسلم يحججن ويطفن وكان الصحابة ومن بعدهم سمعون من الحديث وهن مستترات الابدان لا الا اشخاص (حافظ ابن حجر روح المعانی ص۷۰ جزو ۲۲)

حضور کے وصال کے بعد ازواج مطہرات حج بھی کرتی تھیں اور طواف بھی۔ صحابہ کرام اُن سے احادیث بھی سنتے تھے۔ اور یہ اپنے بدن کے چھپانے کے حصہ کو ڈھانپ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ لیکن اشخاص سے نہیں چھپتی تھیں۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا گھروں سے باہر نکلتے وقت عورتوں کو نقاب یا برقعہ پہننے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا وہ چہرہ کھول کر بھی باہر جا سکتی ہیں مندرجہ آیات میں سے دوسری آیت میں عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ باہر جاتے ہوئے وہ اپنا جلباب اپنے نزدیک کرلیں تاکہ پہچانی نہ جاسکیں اور اس لئے کسی کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ اُنھیں ستائے۔ تیسری آیت میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ عورتیں اپنی زینت و آرائش کا اظہار نہ کریں۔ بجز اس زینت کے جس کا اظہار خود بخود ہو جائے (الا ما ظهر منها)۔ ان دونوں آیات کے بارے میں مفسرین ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ 'جلباب' سے کیا مراد ہے۔ اور (الا ما ظهر منها) کی تعریف میں جسم کے کون سے حصے آتے ہیں۔ نیز یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ جلباب کا حکم صرف آزاد عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ یا لونڈیوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اس آخری سوال سے مسئلہ زیر بحث کی نوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے ہم پہلے اس امر سے بحث کریں گے کہ آیا اسلام نے عصمت و عفت کے تحفظ میں آزاد عورتوں اور لونڈیوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھا ہے، کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوگا

کہ جلباب نزدیک کرنے کے حکم کا محرک کیا تھا اور آیا وہ اسباب اور محرکات اب بھی باقی ہیں جن کی بنا پر یہ حکم نافذ کیا گیا۔ جہاں تک لونڈیوں اور آزاد عورتوں کی حیثیت کا سوال ہے۔ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں :-

و قال ابو حیان نساء المؤمنین یشتمل الحرائر و الاماء و الفتنة بالاماء اکثر لکثرة تصرفهن بخلاف الحرائر فیحتاج اخراجهن من عموم النساء الیٰ دلیل واضح انتہیٰ و انت تعلم ان وجه الحرة عندنا لیس بعورة فلا یجب ستره و یجوز النظر من الاجنبی الیه ان امن الشهوة مطلقاً والا فیحرم -

ابو حیان کا بیان ہے کہ نساء المومنین میں آزاد عورتیں اور لونڈیاں دونوں شامل ہیں، بلکہ لونڈیوں کے کام کاج اندر باہر آنے جانے کے باعث فتنہ کا دروازہ آزاد عورتوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے کھلنے کا خطرہ ہے۔ پس نساء المومنین کے لفظ سے لونڈیوں کو علیحدہ رکھنے کے لئے کسی واضح دلیل کی ضرورت ہے اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ آزاد عورتوں کا چہرہ ہم سنی مسلمانوں کے نزدیک پردہ میں داخل نہیں ہے کہ اس کا ڈھکنا ضروری ہو۔ اس لئے ایک اجنبی شخص اگر قابو میں رہتے ہوئے غیر عورت کا چہرہ دیکھے تو کوئی ہرج نہیں اور اگر قابو میں نہ

رہ سکے تو اس کو اس سے بچنا چاہئے۔

ابن حزم اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے محلیٰ میں حسب ذیل رائے کا اظہار کرتے ہیں :-

واما الفرق بین الحرة والامة فدین الله تعالیٰ واحد والخلقة والطبیعة واحدة کل ذالك فی الحرائر والاماء سواء حتی یاتی نص فی الفرق بینهما فی شیئ فیوقف عنده فان قیل ان قول الله تعالیٰ (ولا یبدین زینتهن الا لبعولتهن او آباءهن) یدل علی انه تعالیٰ اراد الحرائر فقلنا هذا هی الکذب بلا شک لان البعل فی لغة العرب السید الزوج وایضاً فالامة قد تتزوج وما علمنا قط ان الاماء ولا یکون لهن ابناء و آباء

آزاد عورت اور لونڈی میں فرق کرنا عجیب دھاندلی ہے خدا کا دین سب کے لئے ہے دونوں کی خلقت ایک اور دونوں کی طبیعت بھی ایک پھر دونوں میں فرق کرنا کہ ایک کے لئے یہ حکم ہے اور دوسری کے لئے یہ بغیر کسی واضح دلیل کے ہرگز لائق سماعت نہیں۔ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ خدا قرآن میں یہ حکم دیتا ہے کہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوند اور باپ وغیرہ پر اس سے معلوم ہوا کہ ایک آزاد عورت ہی کا خاوند اور باپ ہوسکتا ہے لونڈی کا باپ اور خاوند کیسے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے اس لئے کہ بعل

واخوال واعمام کما
للحرائر او قد ذھب بعض
من وھل فی قول اللہ تعالیٰ
(یدنین علیھن من جلابیبھن
ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا
یوذین) الیٰ انه ما امر
اللہ تعالیٰ بذالک لان
الفساق کانو یتعرضون
للنساء وللفسق فامر الحرائر
بان یلبسن الجلابیب یعرف
الفساق انھن حرائر فلا
یتعرضون۔ قال علی او نحن
نبراو من ھذا التفسیر
الفاسد الذی ھو مازلة
عالم ووھلة فاضل عاقل
او افتراء کاذب فاسق
لان فیه ان اللہ تعالیٰ
اطلق الفساق علی اعراض
اماء المسلمین وھذہ
مصیبة الابد وما
اختلف اثنان من اھل

لغت عرب میں مالک اور خاوند
دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے
پھر یہ سوچئے کہ کیا لونڈی نکاح
کرکے خاوند نہیں بن سکتی ہے
اور اس سے بڑھ کر کیا لونڈیاں
دنیا میں بے رشتے کے ہوتی ہیں
کہ نہ ان کا کوئی باپ ہے نہ بیٹا
نہ ماموں اور نہ چچا بس رشتہ دار
آزاد عورتوں ہی کے ہوتے
ہیں۔ عجیب مذاق ہے اور بعض
حضرات کو اس آیت سے غلط
فہمی ہوتی ہے کہ عورتیں باہر نکلتے
وقت اپنی چادریں نیچی کرلیا کریں
تاکہ لوفر انہیں پہچان کر چھیڑ چھاڑ
کرنے سے باز رہیں۔ چونکہ بدمعاش
ہر شریف اور غیر شریف عورت سے
سوقیانہ مذاق کیا کرتے تھے۔ اس
لئے آزاد عورتوں کو حکم دیا گیا
کہ وہ اس طرح سے نکلا کریں کہ
ان میں اور لونڈیوں میں فرق
ہوسکے۔ مصنف کتاب علی فرماتے

الاسلام فی ان تحریم الزناء بالحرہ کتحریمہ بالامۃ وان الحد علی الزانی بالحرہ کالحد علی الزانی بالامۃ ولا فرق

(محلی ابن حزم)

ہیں کہ ہم اس فاسد تفسیر سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں یا تو یہ کسی عالم سے بھول ہوئی ہے اور یا کسی کاذب فاسق کی گھڑنت ہے غضب خدا کا بقول ان کے خدا نے بد معاشوں کو کھلی چھٹی دیدی ہے کہ وہ مسلمان لونڈیوں کی عصمتوں کے شیشے کو چکنا چور کرتے پھریں اور آزاد مسلمان عورتیں بچی رہیں۔ ہمیں تو دنیائے اسلام میں دو شخص بھی ایسے نہیں ملے جن کا یہ خیال ہو کہ آزاد عورت سے زنا کرنا تو حرام ہے اور لونڈی سے نہیں یا آزاد عورت سے زنا کرنے پر حد لگائی جائیگی اور لونڈی سے زنا پر حد نہیں لگے گی۔ پھر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پردہ کے بارے میں یہ تفریق کیسی اور کہاں سے لگائی گئی ہے۔

آلوسی اور ابن حزم دونوں اصحاب اس بارے میں متفق ہیں کہ

جلباب نزدیک کرنے کا حکم آزاد عورتوں اور لونڈیوں دونوں کے لئے ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ لونڈیاں اس زمانہ میں بھی کام کاج کی وجہ سے بکثرت باہر آتی جاتی تھیں اور ان کا چہرہ اور ہاتھ کھلے رہتے تھے۔ لہذا اگر جلباب نزدیک کرنے سے قرآن کی یہ مراد ہوتی کہ عورتیں نقاب اور برقعہ سے اپنے چہرہ کو ڈھانپے رہیں تو لونڈیوں کو بھی اس آیت کے نزول کے بعد برقعہ یا نقاب کا استعمال کرنا پڑتا۔ چونکہ یہ ثابت ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے بعد بھی لونڈیاں کھلے چہرہ اور ہاتھوں کے ساتھ باہر آتی جاتی تھیں لہذا اس امر میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ جلباب نزدیک کرنے کا حکم چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے اور عورتوں کو اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ بوقت ضرورت چہرہ کھول کر باہر آجائیں۔

جہاں تک لفظ جلباب کے معنوں کا تعلق ہے اس بارے میں مصنف فتح البیان لکھتے ہیں:۔

وعن عائشۃ رضی اللہ عنہ قالت رحم اللہ نساء الانصار لما نزلت یا ایھا النبی قل لازواجک الآیۃ شققن مروطھن فاعتجرن بھا فصلین خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان علیٰ رؤسھن

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ خدا انصاری عورتوں پر رحم کرے جب یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا النبی قل لازواجک تو انھوں نے اپنی بڑی چادروں کو پھاڑ ڈالا اور اُن کے ساتھ لپٹ گئیں۔ (کیونکہ اس زمانہ میں عورتیں زیادہ کپڑے بھی نہیں پہنتی تھیں)

المغربان۔
(فتح البیان)

پھر اسی حالت میں وہ حضور کے پیچھے نماز پڑھنے لگیں گویا کہ ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہوئے ہیں

ابن کثیر کا بیان ہے:۔

والجلباب ھی الرداء فوق الخمار وقال عکرمہ تغطی ثغرۃ نحرھا بجدبا بہا تدنیہ علیہا

جلباب دوپٹہ کے اوپر اوڑھنے کی چادر کا نام ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں چادریں لٹکانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے سینہ کو اوپر تک ڈھانک لیتی تھیں۔

حافظ ابن حجر روح المعانی میں لکھتے ہیں:۔

والجلابیب جمع جلباب وھو علی ما روی عن ابن عباس الذی یستر من فوق الی اسفل وقیل کل ثوب تلبسہ المرأۃ فوق ثیابہا وقیل ھو ثوب اوسع من الخمار ودون الرداء

جلابیب جلباب کی جمع ہے اور یہ ابن عباس کے قول کے بموجب وہ چیز ہے جو اوپر سے نیچے تک ڈھانپ لے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جلباب ہر وہ کپڑا ہے جو عورت اپنے کپڑوں کے اوپر پہنے اور اوڑھے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جلباب دوپٹہ سے بڑے اور بڑی چادر سے چھوٹے کپڑے کا نام ہے۔

ان بیانات اور تشریحات کو قرآن کی اُن آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنا

چاہئے جن میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کو اپنی زینت پوشیدہ رکھنی چاہئے بجز اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور انہیں باہر آتے ہوئے جلباب نزدیک کر لینا چاہئے تاکہ انہیں پہچانا جا سکے اور ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کی جا سکے۔ اس طرح قرآن کی آیات اور اس تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے جس کی بنا پر قرآن نے یہ احکام صادر کئے تھے۔ اس سے ہمیں دو چار باتیں معلوم ہوتی ہیں اولاً قبل اسلام عربوں کے معاشرتی معیارات اتنے پست تھے کہ باہر نکلنے والی عورتوں کے ساتھ ادنیٰ سیرت کے لوگ چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے دوئم اسلام سے پہلے عربوں کی عورتیں لباس پہننے میں احتیاط نہیں برتتی تھیں اور بہت کم کپڑے استعمال کرتی تھیں۔ سوئم یہ حالات اس وقت تک قائم رہے جب تک اسلام نے پورے طور پر اپنے نظام کو برپا نہیں کیا چہارم اسلام نے عورتوں کو ایک بڑی چادر استعمال کرنے کی جو ہدایت دی اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ باخبر ہو جائیں کہ اب شرم و حیا کے کچھ نئے معیارات قائم ہو گئے ہیں اور باہر نکلنے والی مسلمان عورتیں ان معیارات کی پابند ہیں اس لئے دوسری غیر مسلم عورتوں اور مسلمان عورتوں کے درمیان کچھ علامات شناخت ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ ان ہدایات کا منشا یہ بھی تھا کہ باہر نکلتے وقت عورتیں اپنی زیب وزینت اور آرائش و زیبائش کا اظہار نہ کر سکیں اب یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک کا معاشرتی اور اخلاقی معیار اتنا بلند ہو گیا ہو کہ اس میں باہر آنے جانے والی عورتوں کے ساتھ مطلقاً تعرض نہ کیا جاتا ہو اور انہیں بالکل اس امر کا اندیشہ نہ ہو کہ بدسیرت لوگ ان کے ساتھ چھیڑ خانی کریں گے تو اس قرآنی حکم کی

ایک علت تو ساقط ہو جاتی ہے، لیکن دوسری علت جس پر یہ احکام مبنی ہیں پھر بھی باقی رہتی ہے یعنی عورتوں کو ان کے حسن وجمال کی نمائش اور زیب و زینت کے اظہار سے روکا جائے اور یہ دوسری علت ایسی ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور معاشرتی حالات کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے اس امر کی کوئی وجہ نہیں کہ زمانہ حال کے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کی مسلمان عورتیں اس قرآنی حکم کی پابندی نہ کریں اور باہر آتے وقت اپنے معمولی کپڑوں کے اوپر ایک بڑی چادر نہ اوڑھیں۔

لیکن اس سے یہ بحث طے نہیں ہوتی کہ آیا گھر سے باہر آنے جانیوالی مسلمان عورتوں کے لئے نقاب یا برقعہ کا استعمال کرنا ضروری ہے یا نہیں اس کا دارومدار اس پر ہے کہ ہم ولا یبدین زینتھن الاما ظھر منھا کے الفاظ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ یعنی عورت کے جسم کے وہ کون سے حصے ہیں جن کو چھپانا اور پوشیدہ رکھنا اس کے لئے ناممکن ہے بجز اس کے کہ اس کے کام میں رکاوٹیں پڑیں اور اس کا گھر سے باہر آنا بیکار ہو جائے نیز یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ان الفاظ کے کیا معنیٰ سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ابو داؤد اور بیہقی کی حسب ذیل روایت ملتی ہے۔ جس سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

عن عائشہ ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و علیھا	حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ اسماء حضور کی خدمت میں باریک کپڑے پہن کر آئیں۔ آپ نے ان

ثیاب رقاق فاعرض عنها
وقال یا اسماء ان المرأة
اذا بلغت المحیض لم یصلح
ان یری منها الا هذا و
اشار الی وجهه وکفه
صلی اللہ علیه وسلم۔

کو دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا اور فرمایا
اسماء جب عورت جوان ہو جائے
تو اس کے بدن کا کوئی حصّہ دوسرے
شخص کی نگاہ توجہ کا مرکز نہیں
بنایا جا ہے، مگر چہرہ اور ہاتھوں
کے کھولنے کی اجازت ہے

اسی طرح حضرت عائشہ کی ایک روایت حسب ذیل ہے :۔

قالت عائشه دخلت علی
ابنته اخی لامی عبداللہ بن
الطفیل مزینة فدخل
النبی صلی اللہ علیه وسلم
فاعرض فقالت عائشه یا
رسول اللہ انها ابنة
اخی وجاریته فقال اذا
عرقت المرأة لم یحل لها
ان تظهر الا وجهها والا
ما دون هذا وقبض علی
ذراع نفسه فترک بین قبضته
اخری۔

تفسیر قرآن طبری مصری)

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ
میرے پاس میرے رشتہ دار کی
بھتیجی مزینۃ آئی اتنے میں رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف
لائے۔آپ نے مزینۃ کو دیکھ کر اپنا
منہ پھیر لیا۔ میں نے عرض کیا حضورؐ
یہ تو میری بھتیجی ہے اور بچہ ہی تو
ہے۔آپ نے فرمایا جب عورت
بالغ ہوجائے تو اس کے لیے
حلال نہیں کہ بجز اپنے چہرہ اور
دونوں ہاتھوں کے اپنے بدن کا
کچھ بھی حصّہ دوسروں پر ظاہر
کرے۔

ابن حزم اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اپنی مشہور تصنیف محلی میں نسائی

کی روایت کے حوالہ سے لکھتے ہیں :-

ان ابن عباس اخبرہ ان امرأۃ من خثعم استفتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع و الفضل بن عباس ردیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ ان فریضۃ للہ فی الحج علی عبادہ ادرکت ابی شیخا کبیرا و لا یستوی علی الراحلۃ فھل یقضی عنہ ان احج عنہ؟ فقال لھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم واخذ الفضل یلتفت الیھا (وفی روایتہ وتنظر الیہ) وکانت امرأۃ حسناء واخذ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الفضل فحول وجھہ من الشق الآخر

حضرت ابن عباس نے خبر دی کہ حجۃ الوداع میں قبیلہ خثعم کی ایک عورت حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی اور فضل بن عباس حضور کی سواری کے پیچھے سوار تھے۔ عورت نے کہا حضور خدا کا مقرر کیا ہوا حج میرے باپ پر فرض ہو گیا ہے لیکن میرے باپ زیادہ بوڑھے ہونے کی وجہ سے سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کرتی ہوں اور یہ حج ان کی طرف سے ادا ہو جائے گا آپ نے فرمایا ہاں۔ عورت بڑی خوبصورت تھی فضل عورت کو تکنے لگے اور عورت فضل کو دیکھنے لگی۔ حضور نے فضل کا منھ دوسری طرف کر دیا۔

فلو كان الوجه عورة يلزم ستره لما اقره عليه السلام على كشفه بحضرة الناس ولامرها ان تسبل عليه من فوق ولو كان وجهها مغطى ما عرف ابن عباس احسناء هي ام شوهاء فتح ما قلناه يقينًا ـ

اگر فی الحقیقت عورت کا چہرہ ستر میں شامل ہوتا تو اوّلاً لوگوں کے سامنے اس عورت کا بے پردہ کھڑا رہنا حضور کیونکر گوارا کر سکتے تھے۔ دوم ابن عباس کو کس طرح معلوم ہوتا کہ عورت خوبصورت ہے یا بدصورت۔ سوم فضل کو بھی دیکھنے کا موقعہ کیونکر ملتا۔ پس ہمارا کہنا صحیح ہوا کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔

یہاں تک تو خود صاحب وحی کے بیان سے الا ظہر منہا کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے نزدیک اس کی تفسیر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن کثیر اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں: ـ

ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها قال ابن عباس وجهها وكفيها والخاتم قال ابن عمر و عطا وعكرمه وسعيد بن جبير وابي الشعثاء والضحاك

ولا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا اس کی تفسیر ابن عباس، ابن عمر، عطا، عکرمہ، سعید، ابی شعثا، ضحاک اور ابراہیم نخعی نے چہرہ دونوں ہاتھ اور انگوٹھی سے کی ہے

و ابراهیم النخعی نحو ذالک

ان ابن عباس ومن تابعه

ارادو تفسیر ما ظهر منها

بالوجه والکفین و هذا

هو المشهور عند الجمهور

تفسیر فتح البیان کا مصنف لکھتا ہے :۔

و اختلف الناس فی ظاهر الزینه و ما هو فقال ابن مسعود و سعید بن جبیر هو الثیاب و زاد سعید الوجه وقال عطا والا وزاعی الوجه والکفان و قال ابن عباس و قتادہ والمسور بن مخرمه هو الکحل و الخاتم و السوار و الخضاب فی الکف الی نصف الساق ونحو ذالک فانه یجوز للمراة ان تبدیه وعن ابن عمر قال الزینة الظاهر ة الوجه و الکفان وقال	لوگوں نے ظاہری زینت کی تعین میں اختلاف کیا ہے ابن مسعود اور سعید نے کہا ہے کہ اس سے کپڑے مراد ہیں اور سعید کے نزدیک چہرہ بھی عطاء اور اوزاعی کہتے ہیں چہرہ اور دونوں ہاتھ آزاد ہیں - ابن عباس قتادہ اور مسور کہتے ہیں سرمہ انگوٹھی کنگن اور ہاتھ کی مہندی مراد ہے۔ عورت کے لئے جائز ہے کہ ان چیزوں کو ظاہر کر سکتی ہے

ابن عباس الا ما ظهر
منها اے وجھا و
کفاھا والخاتم
وانما رخص فی ھذا القدر للمراۃ ان تبدیہ عن بدنھا لان المراۃ لا تجد بدا من مزاولہ الاشیا بیدیھا و من الحاجۃ الی کشف وجھھا خصوصًا فی الشھادۃ والمحاکمہ والنکاح وتضطر الی المشیٔ فی الطرقات وظھور قدمیھا

ابن عمر کہتے ہیں ظاہری زینت سے مراد چہرہ اور ہاتھ اور انگوٹھی ہیں۔ عورت کو ان چیزوں کو ظاہر کرنے کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ ان کے اظہار کے لئے مجبور ہے ہاتھ ظاہر نہ کرے تو کسی سے کوئی چیز لے دے نہیں سکتی۔ چہرہ نہ کھولے تو شہادت محاکمہ اور نکاح سے محروم رہتی ہے۔ قدم نہ کھولے تو چل پھر نہیں سکتی ہے۔

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے بعد بڑے بڑے ائمہ کا درجہ ہے۔ اس باب میں ان کی آرا بھی لائق غور ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

وقال المالك والحرۃ کلھا عورۃ الا وجھھا ویدیھا (روح البیان)

امام مالک فرماتے ہیں ایک آزاد عورت کا سارا بدن پردہ میں شامل ہے مگر اس کا چہرہ

اور دونوں ہاتھ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

وقال الشافعی والحرۃ کلها عورۃ سوی الوجه والکفین (روح البیان)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ آزاد عورت کے چہرہ اور ہاتھ کے سوا باقی بدن قابل ستر ہے

وقال احمد والحرۃ کلها عورۃ سوی الوجه (روح البیان)

امام احمد کے نزدیک سوا چہرہ کے باقی حصہ آزاد عورت کا ستر کے قابل ہے

وقال ابی حنیفه ولا یجوز ان ینظر الرجل الی الاجنبیه الا الیٰ وجهها وکفیها (هدایه)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ایک اجنبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسری اجنبی عورت کو دیکھے مگر اُس کا چہرہ اور ہاتھ دیکھ سکتا ہے۔

قال ابو یوسف انه یباح النظر الی ذراعیها (ہدایہ)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اس کی کلائیوں کو بھی دیکھنا جائز ہے۔

وقال الامام ابن حزم واما الامراۃ فان الله تعالیٰ یقول (ولا یبدین زینتهن الا ما ظهر منها)

امام ابن حزم فرماتے ہیں خدا عورتوں کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ نہ ظاہر کریں اپنی زینت میں سے کچھ مگر وہ جو ظاہر ہے

فامرهن الله تعالیٰ
بالضرب بالخمار علی
الجیوب وهذا نص
علی ستر العورة والعنق
والصدر وفیه نص علیٰ
اباحة کشف الوجه لا
یمکن غیر ذالک اصلاً و
هو قوله تعالیٰ ولا یضر
بن بارجلهن لیعلم ما
یخفین من زینتهن)
نص علی ان الرجلین و
الساقین مما یخفی ولا
یحل ابداًه - عن ام
عطیه قالت امرنا رسول
الله صلی الله علیه وسلم
ان تخرجهن فی الفطر
والاضحی العواتق والحیض
وذوات الخدر قالت
قلت یارسول الله احدانا
لا یکون لها جلباب قال
لتلبسها اختها من

اس میں سے اس میں عورتوں
کو بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی پوشیدہ
چیز نہ ظاہر کریں۔ نہ سینہ ننگا
کریں اور نہ گردن بلکہ ان کو
ڈھانک رکھیں اور اپنا منہ کھول
لیا کریں۔

آگے خدا فرماتا ہے کہ چلتے
وقت اپنے پیر زمین پر زور
سے نہ ماریں تاکہ جو زینت
چھپی ہے وہ اجنبیوں کا مرکز
توجہ نہ بن سکے۔ اس میں بتایا
گیا ہے کہ پیر اور پنڈلی ظاہر
کرنے کی چیزیں نہیں ہیں ان
کو چھپانا چاہیئے۔ حضرت ام
عطیہ فرماتی ہیں کہ حضور نے ہمیں
حکم دیا کہ ہم عید اور بقرعید میں
اپنی کنواری لڑکیوں حیض والیوں
اور پردہ داروں کو لیکر عیدگاہ
جائیں۔ میں نے کہا کہ حضور ہم
میں سے ہر ایک کے پاس

جلبابها (مسلم) قال علی و
هذا امر بلبسهن الجلابيب
للصلواة والجلباب فی لغة
العرب التی خاطبنا بها
رسول الله صلی الله علیه
وسلم هو ما غطی جمیع
الجسم لا بعضه فهو ما
قلنا قال عبد الرحمن
بن عابس سمعت ابن
عباس یذکرانه شهد
العید مع رسول الله
صلی الله علیه وسلم
وانه علیه السلام خطب
بعد ان صلی ثم اتی النساء
ومعه بلال فوعظهن و
ذکرهن وامرهن ان
یتصدقن فرأیتهن یهوین
بایدیهن یقذفنه فی
ثوب بلال (بخاری)
فهذا ابن عباس بحضرة
رسول الله صلی الله علیه

چادر نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا
چادر والی عورت اپنی بے چادر والی
دوسری بہن کو اپنے ہمراہ لے
جائے۔ یہاں حضور نے نماز عید
میں شامل ہونے کے لئے چادر
اوڑھ لینے کا حکم دیا ہے اور
جلباب لغت عرب میں اس چادر
کو کہتے ہیں جس سے عورت کا
سارا جسم ڈھک جائے نہ کہ بدن
کا کچھ حصہ اس سے ہمارے قول
کی تائید ہوتی ہے کہ عورت کا
سارا بدن ستر میں شامل
ہے بجز چہرہ اور دونوں
ہاتھوں کے۔ حضرت ابن
عباس فرماتے ہیں کہ میں حضور
کے ساتھ نماز عید میں
شامل ہوا۔ بلال آپ کے
ساتھ تھے۔ آپ نے نماز
کے بعد خطبہ ارشاد
فرمایا۔ پھر عورتوں کی طرف
گئے اُن کو وعظ ونصیحت کی

وسلم الى ايديهن فصح ان اليد من المرأة والوجه ليسا عورة وما عداهما فرض عليها۔

بعد صدقہ کرنے کا حکم دیا میں نے عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بلال کے کپڑے میں اپنے زیورات وغیرہ ڈال رہی تھیں۔

اب دیکھئے حضور کی موجودگی میں ابن عباس نے عورتوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جس سے معلوم ہوا کہ عورت کے ہاتھ اور چہرہ ستر میں شامل نہیں ان کے علاوہ باقی سارا بدن ستر میں شامل ہے جس کا ڈھانکنا عورت پر فرض ہے

آئمہ کے علاوہ تقریباً بڑے بڑے مفسرین کی بھی یہی رائے ہے کہ عورت چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ طبری اپنی تفسیر قرآن میں صحابہ اور تابعین وغیرہ کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

واولى الاقوال فى ذالك بالصواب قول من قال عنى بذالك الوجه و

مندرجہ بالا اقوال میں سے بہتر قول اور ٹھیک بات اس کی ہے جس نے الا ما ظهر منها سے مراد چہرہ اور ہاتھ لیئے

اذا كان لذالك الكحل
والخاتم والسوار و
الخضاب وانما قلنا ذالك
بالتاويل لاجماع الجميع
على ان كل مصلى ان يستر
عورته فى صلوته وان
المراة ان تكشف وجهها
وكفيها فى صلوتها وان
عليها ان تستر ما عدا
ذالك من بدنها الا
ما روى عن النبى صلى الله
عليه وسلم انه اباح لها
ان تبدى من ذراعها
الى قدر النصف فاذا كان
ذالك من جميعهم اجماعًا
كان معلومًا بذالك ان لها
ان يبدى من بدنها مالم
يكن عورة كما ذالك للرجال
لان ما لم يكن عورة فغير
حرام اظهاره واذا كان
لها اظهار ذالك كان

میں سرمہ انگوٹھی، کنگن اور
مہندی آجائیں گے۔ ظاہر ہے
کہ جب ہاتھ کھلے گا تو ہاتھ کی انگوٹھی
بھی دکھائی دیگی اور مہندی بھی
دکھائی دیگی اور جب چہرہ کھلے گا
تو آنکھوں کا سرمہ بھی نظر آئے گا
اور ہم نے اُسے بہتر قول اس لئے
قرار دیا ہے کہ باقی تمام اقوال اس
میں سما سکتے ہیں اور اس پر سب کا
اتفاق ہے کہ ہر نمازی مرد کو نماز
پڑھنے سے پہلے اپنے "پردے
کی چیز" کا ڈھانکنا ضروری ہے
اور عورت کے لئے ضروری ہے کہ
بدن کے باقی اعضاء کو ڈھانک
کر ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھے۔ دوسری
روایت کی رو سے کہنی تک
ہاتھ کھول سکتی ہے۔ جب
عورت نماز میں چہرہ اور
ہاتھ کھلا رکھے گی اور باقی
بدن کو ڈھانک لے گی تو
معلوم ہوا کہ ہاتھ اور چہرہ پردہ

لما اظہار ذالک کان معلوماً انہ مما استثناہ اللہ تعالیٰ ذکرہ بقولہ الا ما ظھر منھا لان کل ذالک ظاھر منھا۔

(تفسیر القرآن للطبری)

میں شامل نہیں ہیں۔ اگر یہ دونوں اعضا پردہ میں شامل ہوتے تو عورت پر فرض ہوتا کہ ان کو بھی ڈھانک لے۔ پھر جو چیز پردہ میں شامل نہیں اس کا کھولنا حرام کس طرح ہو سکتا ہے۔ جس طرح ایک پردہ والی چیز کا کھولنا حرام ہے اس طرح ایک غیر پردہ والی چیز کا کھولنا حرام اور ناجائز نہیں ہو سکتا پس معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے کلام میں عورت کے لئے جس چیز کا استثنار کیا ہے وہ چہرہ اور ہاتھ ہی ہے کہ عورت ان دونوں اعضار کو کھول سکتی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور ائمہ کی ایک بہت بڑی اکثریت کا اس امر پر اتفاق کہ عورتوں کے لئے باہر آتے جاتے وقت کسی قسم کا نقاب یا برقعہ وغیرہ پہننا ضروری نہیں اور اسلام نے انھیں چہرہ اور ہاتھ کھول کر باہر آنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جسم کے باقی تمام حصے مثلاً سینہ، گردن، پنڈلیں وغیرہ بند ہونے چاہئیں اور عورت کو اپنا سارا جسم ایک بڑی چادر

سے ڈھانپ لینا چاہیئے تاکہ جسم کا اور کوئی حصہ بغیر چہرہ اور آنکھوں کے کھلا نہ رہے۔ ایسا کوئی لباس جس سے جسم کے اعضاء چھپے رہنے کے بجائے اور زیادہ نمایاں ہو کر نظر آئیں احکام اسلام کی روسے قطعًا ممنوع ہے

تاریخ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ کے زمانہ میں مسلمان عورتوں کا عمل بالکل انھیں ہدایات کے مطابق تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں مسلمان عورتیں اپنے معاشی اغراض، تمدنی علمی اور مذہبی ضروریات کے لئے بلاتکلف باہر آتی جاتی تھیں اور ان کے چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوتے تھے۔ کسی قسم کے نقاب یا برقعہ کا استعمال اس زمانہ میں نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ جب مسلمان عورتیں باہر آتی تھیں تو وہ پوری طرح ملبوس ہوتی تھیں۔ چہرہ اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں ہوتا تھا اور وہ اپنے حسن و جمال یا زینت و آرائش کا کسی موقعہ اور کسی حالت میں اظہار نہیں کرتی تھیں۔ مثلاً حضرت عائشہ سے روایت ہے :-

عن عائشہ قالت لقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی الفجر فتشہد معہ نساء من المومنات متلفعات بمروطھن ثم یرجعن الی بیوتھن وما یعرفھن احد من الغلس	عائشہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے اور آپ کے ساتھ بعض مومن عورتیں بھی حاضر ہوتی تھیں وہ اپنے بدنوں کو چادروں میں لپیٹے ہوتی تھیں پھر نماز پڑھ کر اپنے گھروں

کی طرف واپس جاتیں اور بہ
سبب اندھیرے کے پہچانی نہ
جاتی تھیں۔

اس روایت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مردوں کی عورتوں کو نہ پہچاننے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ برقعے یا نقابیں پہنے تھیں بلکہ اندھیرے کی وجہ سے ان کا پہچاننا دشوار تھا۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے :-

عن سبیعۃ الاسلمیۃ انھا کانت تحت سعد بن خولۃ۔ ھو من بنی عامر بن لؤی وکان ممن شھد بدراً فتوفی عنھا فی حجۃ الوداع وھی حامل فلم تنشب ان وضعت حملھا بعد وفاتہ فلما تعلت من نفاسھا تجملت للخطاب فدخل علیھا ابو السنابل من بعکک رجل من بنی عبد الدار فقال لھا مالی اراک متجملۃ لعلک ترجین النکاح واللہ ما انت

سبیعہ اسلمیہ سے روایت ہے کہ وہ سعد بن خولہ کے نکاح میں تھی جو بنو عامر بن لوئی کے قبیلے سے تھا اور جنگ بدر میں شرکت کر چکا تھا وہ حجۃ الوداع میں فوت ہو گیا اور یہ حاملہ تھی اس کے مرنے کے بعد کچھ دیر نہ ہوئی کہ اس نے وضع حمل کیا جب اپنے نفاس سے پاک ہوئی تو لوگوں کی درخواست کے لئے بناؤ سنگھار کر کے بیٹھی ابو سنابل بن بعکک جو قبیلہ بنی عبد الدار سے تھا اس کے گھر آیا اور کہا کیا بات

بنا کح حتی تمر علیك اربعة اشہر و عشر قالت سبیعة فلما قال لی ذالك جمعت علی ثیابی حین امسیت فاتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسألته عن ذالک فافتانی بانی قد حللت حین وضعت حملی و امرنی بالتزویج ان بدا لی

ہے کہ میں تجھے زینت و آرائش کرکے بیٹھے دیکھتا ہوں شاید تو نکاح کا ارادہ رکھتی ہے۔ قسم خدا کی جب تک چار ماہ دس دن نہ گزر جائیں تو نکاح نہیں کرسکتی سبیعہ کہتی ہے جب اس نے یہ کہا تو میں نے شام اپنے بدن پر کپڑے سنبھال لئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے سوال کیا آپ نے مجھے یہی فتویٰ دیا کہ حمل جننے سے میں حلال ہوگئی اور آپ نے مجھے نکاح کا حکم دیا۔

اس واقعہ میں قابل ذکر امر یہ ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے بعد کا واقعہ ہے جب کہ عورتوں کے لباس اور رفتار و گفتار وغیرہ کے متعلق اسلامی احکام نافذ کئے جا چکے تھے۔ یہ اس دور کا واقعہ نہ تھا جب کہ اسلامی شرم و حیا کے معیارات غیر متعین تھے اور عورتوں کو کامل آزادی حاصل تھی کہ وہ جس طرح چاہیں باہر نکلیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سبیعہ نقاب یا برقعہ پہنے ہوئے نہیں بیٹھی تھی بلکہ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا ورنہ ابوالسنابل کے لئے اس کا

پہچاننا ممکن نہ تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سبیعہ نے محض اس عذر کی بنا پر اپنا چہرہ کھول رکھا تھا کہ وہ دوسرے نکاح کے لئے پیام کی متلاشی تھی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے عادتاً اور رواجاً ایسا کیا ورنہ ابوالسنابل اس کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اس سے یوں گفتگو نہ کرتے انداز گفتگو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ ابوالسنابل اس کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ اگر عورتوں کو کھلے چہرہ کے ساتھ اسلام نے باہر آنے کی اجازت نہ دی ہوتی تو یہ صورت ناممکن تھی۔ پھر سبیعہ کہتی ہے کہ میں نے اپنے کپڑے جمع کئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام اسلامی کے نفاذ کے بعد عورتیں ایک دو کپڑے پہن کر باہر نہیں نکلتی تھیں بلکہ بہت سے کپڑے استعمال کرتی تھیں تاکہ چہرہ اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصّہ کھلا نہ رہ جائے۔ ان تمام باتوں سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ کرام کے زمانہ میں عورتیں اس طرح کا پردہ نہیں کرتی تھیں جیسا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے متوسط طبقوں کی عورتیں کرتی ہیں بلکہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے کاموں کے لئے باہر آتی جاتی تھیں۔ البتہ ان واقعات سے ہم اس نتیجہ پر بھی پہونچتے ہیں کہ اس زمانہ کی مسلمان عورتیں باہر آتے جاتے وقت اسلامی شرم و حیا کے معیارات کی کامل پابندی کرتی تھیں اور بے حجابانہ یا نیم عریاں لباس پہن کر باہر نہیں نکلتی تھیں۔ اسلامی زندگی کا جو نقشہ اس وقت تھا اس سے نہ موجودہ مسلمان عورتوں کے رواجی پردہ کا جواز نکلتا ہے اور نہ اس آزادی، بے باکی اور بے حجابی کا جو مغربی تہذیب کا طرّہ امتیاز ہے اور جس کے

تحت عورتوں کو گھروں سے باہر نکلتے وقت گفتار و رفتار اور لباس و پوشاک کی کوئی پابندی نہیں کرنی پڑتی۔ روشن خیال حضرات پردہ کی مخالفت میں معاملہ کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اصل میں اسلام نظر کے پردے لباس کے پردے اور حسن و جمال کے پردے کا حامی ہے لیکن چہرہ کے پردہ کا مخالف ہے۔

علاوہ ازیں اسلام مردوں اور عورتوں کے بلا ضرورت اختلاط کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور سرکاری تقاریب سیاسی مجلسوں یا تعلیمی کانفرنسوں نیز اسی نوع کے دیگر ضروری معاشرتی مشاغل میں عورتوں اور مردوں کو صرف بحد ضرورت ملنے جلنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ بے حجابی اور بے تکلفی کی روش نہ اختیار کریں عورتوں اور مردوں کی رفتار و گفتار اور لباس و پوشاک پر جو پابندیاں اسلام نے لگائی ہیں ان کی غرض یہی ہے کہ وہ گھر سے باہر ایک دوسرے کے ساتھ آزادی اور بے تکلفی سے نہ ملیں اور نہ ان کے درمیان عارضی طور پر یا مستقلاً دوستانہ مراسم پیدا ہوں۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ باہر چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھیں۔ اب اگر اس حکم کی پابندی کی جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عورتیں اور مرد بلا ضرورت ڈنر پارٹیوں میں سینما تھیٹر میں یا رقص و سرود اور دیگر تفریحی مجالس میں ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے مل جل سکیں یا آپس میں بے تکلفی سے گفتگو کریں۔ عہد رسالت یا خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہمیں ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ عورتیں سیاسی مجلسوں یا مذہبی اور تمدنی اجتماعات میں مردوں

کے ساتھ اس طرح شریک ہوئی ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی۔ دوستی اور محبت کی باتیں کر سکیں۔ بلا شبہ عورتوں نے مردوں کے ساتھ اس قسم کے اجتماعات میں بھی حصّہ لیا مگر اس طرح کہ عورتوں کی جماعت مردوں سے بالکل الگ تھلگ رہی یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی نماز کے وقت مردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہوتی تھیں۔ کسی عورت کے پہلو میں کوئی مرد نہیں کھڑا ہو سکتا تھا، اور نہ کوئی عورت کسی مرد کے قریب بیٹھ سکتی تھی۔ اس تفریق میں ماں اور بیٹے یا بھائی اور بہن وغیرہ کے تعلق کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ صف بندی کے بارے میں حضور کا صاف ارشاد ہے کہ عورتوں کے لئے بہترین صفیں پیچھے کی صفیں اور بدترین صفیں آگے کی صفیں ہیں۔ بخاری میں عطا کی ایک روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں کعبہ کا طواف کرتی تھیں لیکن انھیں مردوں سے بالکل الگ رکھا جاتا تھا اور مردوں کے ساتھ کسی قسم کے میل جول اور بات چیت کی اجازت نہ تھی۔

اسی طرح مردوں عورتوں کے بلا ضرورت اختلاط کی ممانعت ابوداؤد کی حسب ذیل روایت سے بھی ثابت ہوتی ہے :۔

عن حمزہ بن اسید الا نصاری عن ابیہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وھو خارج	حمزہ بن ابو اسید انصاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکل رہے تھے کہ آپ نے دیکھا

من المسجد فاختلط الرجال مع النساء فی الطریق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للنساء استاخرن فانہ لیس لکن ان تحققن الطریق فکانت المراۃ تلصق بالجدار من لصوقھا (ابوداؤد ماجاء فی مشی النساء فی الطریق)	کہ راستہ میں مرد عورتوں کے ساتھ مل گئے۔ آپ نے عورتوں سے فرمایا کہ تم پیچھے ہو جاؤ۔ تمہارے لئے راستہ کے بیچ میں چلنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم راستہ کے کنارے سے چلو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد عورتیں بالکل دیوار سے لگ جاتی تھیں یہاں تک کہ ان کی چادریں دیوار سے الجھتی تھیں۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر ٹھہر جاتے کہ عورتیں نکل جائیں تاکہ راستہ میں عورتوں اور مردوں کا تصادم نہ ہو۔ اسی سلسلہ میں عبداللہ بن عمر کی یہ بھی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

مردوں اور عورتوں کے بلا ضرورت اختلاط کی اس ممانعت سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ اسلام عورتوں کو معاشی کاروبار، صنعتی مشاغل، سیاسی جدوجہد یا تمدنی امور میں حصہ لینے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ ایسی کئی احادیث اور روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو معاشی کاروبار اور جنگی ضروریات کے لئے ٹرننگ وغیرہ کی تربیت حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً

حضرت اسما بنت ابو بکر سے روایت ہے :-

عن اسماء بنت ابو بکر قالت تزوجنی زبیر وما له فی الارض من مال و لا مملوك ولا شئ غیر ناضح وغیر فرسه فکنت اعلف فرسه واستقی الماء واخرز غربه واعجن ولم اکن احسن احبز وکان یخبز لی جارات من الانصار وکن نسوة صدق وکنت انقل النوی من ارض الزبیر التی اقطعه رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی منی علی ثلثی فرسخ فجئت یوما والنوی علی راسی فلقیت رسول الله صلی الله علیه وسلم ومعه نفر من الانصار فدعانی ثم قال اخ اخ لیحملنی خلفه فاستحییت ان اسیر مع الرجال و

حضرت اسماء بنت ابو بکر کا بیان ہے کہ میرا نکاح زبیر سے ہوا اُن کے پاس سوا ایک اونٹ اور ایک گھوڑے کے نہ غلام تھا اور نہ زمین میں کچھ مال وغیرہ۔ میں خود ہی گھوڑے کو گھاس وغیرہ ڈالتی اور پانی پلاتی نیز گھر کا کام کاج آٹا وغیرہ گوندھنا یہ سب کچھ کرتی تھی البتہ مجھے اچھی روٹیاں پکانی نہیں آتی تھیں۔ اس کے لئے پڑوس کی چند انصاری لڑکیاں آجاتی تھیں اور وہ روٹیاں پکا دیتی تھیں اور یہ لڑکیاں تھیں بھی بہت اچھی۔ اور میں علاوہ دیگر کاموں کے زبیر کی زمین کے اس ٹکڑے میں سے جو حضور نے ان کو دے رکھا تھا اپنے سر پر گٹھلیوں کی گٹھری بھی اُٹھا کر لاتی تھی وہ زمین میرے گھر سے دو تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ ایک

ذکرت الزبیر وغیرته و
کان اغیر الناس فعرف
رسول الله صلی الله علیه
وسلم انی قد استحییت
فمضی فجئت الزبیر فقلت
لقینی رسول الله صلی الله
علیه وسلم وعلی راسی
النوی ومعه نفر من
اصحابه فاناخ الرکب
فاستحییت منه وعرفت
غیرتک - فقال والله لحملک
النوی کان اشد علی من
رکوبک معه قالت حتی
ارسل الی ابو بکر بعد
ذالک بخادم یکفینی سیا
سة الفرس فکانما
اعتقنی

(بخاری - مصری منکا

دن میں گٹھلیاں اٹھائے چلی
آرہی تھی کہ راستہ میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات
ہوئی - آپ کے ساتھ چند انصاری
بھی تھے - حضور نے مجھے دیکھ کر
اپنے اونٹ کو اخ اخ کر کے بٹھانا
چاہا تاکہ مجھے اپنے ساتھ سوار کرلیں
لیکن مجھے شرم محسوس ہوئی کہ
آدمیوں کے ساتھ ساتھ چلوں
اور پھر اپنے خاوند زبیر اور ان
کی عزت کا بھی مجھے خیال آگیا
کیونکہ میرے خاوند بہت ہی غیرتمند
تھے - حضور نے میرے تذبذب
سے پہچان لیا کہ میں شرما رہی
ہوں چنانچہ آپ تشریف لے گئے
اور مزید اصرار نہ فرمایا - میں گھر
واپس آگئی - خاوند آئے اور میں
نے ان سے راستہ میں حضور کی ملاقات
اور اونٹ کے بٹھانے کا قصہ
دہرایا اور اپنے شرمانے اور
تمہاری غیرت کا ذکر کیا - حضرت

زبیر نے کہا خدا کی قسم حضورؐ کے
ساتھ بیٹھنے میں میری غیرت کو
اتنا دھکا نہ لگتا جتنا تمہارے
سر پر گٹھلیوں کا اٹھانا میری غیرت
کو ناگوار ہے

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ میں
یہ سب کام سرانجام دیتی رہی
یہاں تک کہ میرے والد ابوبکر
نے ایک خادم میرے پاس بھیجدیا
جس نے گھوڑے وغیرہ کی خدمت
سے مجھے بے نیاز کر دیا۔

اس روایت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں نقاب یا برقعہ پہنے بغیر اپنے معاشی کاروبار کے سلسلہ میں آزادی سے باہر آتی جاتی تھیں اور کھیتی باڑی کے کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ اس امر کی مزید تصدیق مندرجہ ذیل روایات سے بھی ہوتی ہے :-

عن سهل قال كانت فينا امرأة تجعل على اربعاء في مزارعة لها سلقاً فكانت اذا كان يوم الجمعة تنزع اصول السلق فتجعله في

حضرت سہل کا بیان ہے کہ ہم میں سے ایک عورت تھی جو اپنے کھیت کی نالیوں میں چقندر بوتی تھی۔ جمعہ کے دن وہ چقندر کی جڑیں نکال کر انھیں ہنڈیا

قدر لنا تجعل فيه قبضة
من شعير تطحنها فتكون
اصول السلق عرقة وكنا
ننصرف من صلاة الجمعة
فنسلم عليها فتقرب ذالك
الطعام الينا فنلعقه وكنا
نتمنى يوم الجمعة لطعامها
(بخاری مصری ص۱۱)

میں ڈال کر پکاتی تھیں، اور
اس پر مٹھی بھر جو کا آٹا پیس کر
ڈال دیتی تھی۔ گویا چقندر کی
جڑیں اس میں بوٹیوں کا کام
دیتی تھیں۔ ہم ہر جمعہ کی نماز کے
بعد اس پر سلام کرتے وہ یہ کھانا
ہمارے سامنے لاتی اور ہم چٹ
کرجاتے۔ ہمیں اس کھانے کی وجہ
سے جمعہ کے دن کا بہت خیال
رہتا تھا۔

اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں
عورتیں معاشی کاروبار میں حصہ لیتی تھیں اور ان پر اس سلسلہ میں
کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ تجارتی کاموں اور خرید وفروخت کے معاملات
میں بھی احادیث سے عورتوں کا حصہ لینا ثابت ہے۔ چنانچہ عبد اللہ
بن عمر سے مروی ہے:۔

عن عبد الله بن عمر قال
ان عائشة ساومت بريرة
فخرج رسول الله صلى الله
عليه وسلم الى الصلوة
فلما جاء قالت انهم ابوان
يبيعوها الا ان يشترطوا الولاء

حضرت عبد اللہ بن عمر کا بیان
ہے کہ حضرت عائشہ نے لونڈی
بریرہ نامی کی آزادی کے لئے
اس کے مالکوں سے بات چیت کی۔
حضور جب نماز کے بعد تشریف
لائے تو حضرت عائشہ نے کہا بریرہ

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما الولاء لمن اعتق (بخاری)

کے مالک اسے فروخت کرنے سے اب انکار کر رہے ہیں۔ ہاں اس شرط پر راضی ہیں کہ بریرہ کے آزاد کرنے کی نسبت اسی کی طرف سے ہوگی جو اُسے خرید کر آزاد کر دے گا۔

اس کے علاوہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ حضرت خدیجہ کی تجارت کا سلسلہ نہایت وسیع تھا اور شام کے تاجروں سے بھی آپ لین دین کرتی تھیں۔ خولار۔ ملیکہ۔ ثقیفہ اور بنت محرمہ عطر کی تجارت کیا کرتی تھیں۔ اکثر صحابیات نے متعدد سیاسی خدمات بھی انجام دیں۔ چنانچہ حضرت شفاء بنت عبداللہ اس درجہ صائب الرائے تھیں کہ حضرت عمر ان کی تحسین کرتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ اسلام میں عورت کے سیاسی اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ وہ دشمنوں کو پناہ بھی دے سکتی ہے سنن ابی داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے زمانہ میں اُم ہانی نے جو حضرت علی رضی اللہ کی ہمشیرہ تھیں ایک مشرک کو پناہ دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قد اجرنا من اجرت وآمنا من آمنت"، ("تم نے جس کو پناہ دی ہم نے بھی اُسے پناہ دی اور تم نے امان دی اُسے ہم نے بھی امان دی")

علاوہ کھیتی باڑی اور خرید و فروخت کے مسلمان عورتوں نے عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں جنگی کاموں میں بھی نمایاں حصہ لیا اور اس زمانہ کے معیار اور طریق کے مطابق وہ کام کیا جو آج کل

دو اخاؤں کی نرسیں کرتی ہیں۔ یعنی زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کے کام۔ چنانچہ ابو حازم کی روایت ہے:-

عن ابی حازم سمع سهل بن السعدی وساله الناس وما بینی و بینه احد اعلم به منی کان علی یجیئ بترسه فیه ماء و فاطمة تغسل من وجهه الدم فاخذ حصیر فاحرق فحشی به جرحه

(بخاری مصری)

ابو حازم کا بیان ہے کہ لوگوں نے حضرت سہل سے حضور کے زخمی ہونے کی کیفیت دریافت کی سہل نے کہا ہاں مجھ سے زیادہ اس واقعہ کا کسی کو علم نہیں۔ حضرت علی اپنی ڈھال میں پانی لا رہے تھے اور حضرت فاطمہ حضور کا چہرہ مبارک اس سے دھوتی جا رہی تھیں (جب خون بند نہ ہوا تو) حضرت فاطمہ یا علی نے ایک بورے کا ٹکڑا لیکر اسے جلایا اور وہ آپ کے زخم میں بھر دیا گیا۔

حضرت انس سے روایت ہے:-

عن انس قال لما کان یوم احد انهزم الناس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لقد رایت عائشه بنت ابی بکر و ام سلیم و انهما لمشمرتان اری خدم

حضرت انس کا بیان ہے کہ جنگ اُحد میں لوگ حضور کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ میں نے حضرت عائشہ اور ام سلیم کو دیکھا کہ اپنی پنڈلیوں پرسے کپڑا اُٹھا پانی کی مشکیں اپنی کمر پر لادکر زخمیوں کو پانی

سوقھما تنقزان القرب علی متونھم تفرغانه فی افواہ القوم (بخاری مصری ۔ کتاب الجہاد والسیر)	پلا رہی تھیں

ثعلبہ بن مالک کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں دوران جنگ میں پھٹی ہوئی مشکوں کی مرمت بھی کرتی تھیں ۔ چنانچہ ثعلبہ کا بیان ہے :۔

عن ثعلبه بن مالک ان عمر بن الخطاب قسم مروطاً بین نساء من النساء المدینة فبقی مرط جید فقال له بعض من عنده امیر المومنین اعط هذا ابنة رسول الله صلی الله علیه وسلم التی عندک یریدون ام کلثوم بنت علی فقال عمر ام سلیم احق وام سلیم من النساء الانصار من بایع رسول الله صلی الله علیه وسلم قال عمر فانها	حضرت ثعلبہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کیں ۔ اخیر میں ایک چادر بچ رہی بعض لوگوں نے آپ سے مشورۃً عرض کیا کہ یہ حضور کی صاجزادی ام کلثوم بنت علی کو جن کا حضرت عمر سے نکاح ہو چکا تھا عنایت کر دیجئے حضرت عمر نے فرمایا اس چادر کی زیادہ حقدار ام سلیم ہیں یہ ام سلیم مدینہ طیبہ کی رہنے والی اور حضور سے بیعت شدہ تھیں ۔ نیز آپ نے فرمایا کہ یہ ام سلیم

كانت تزفر لنا القرب يوم احد قال ابو عبد الله تزفر تخيط

جنگ احد میں ہماری پھٹی ہوئی مشکیں سیتی اور مرمت کرتی تھیں۔

اسی طرح حضرت حفصہ کی روایت ہے :-

عن حفصة قالت كنا نمنع عواتقنا ان يخرجن فى العيدين فقدمت امرأة فنزلت قصر بنى خلف فحدثت عن اختها وكان زوج اختها غزا مع النبى صلى الله عليه وسلم ثنتى عشرة غزوة وكانت اختى معه فى ست قالت فكنا نداوى الكلمى ونقوم على المرضى

(بخاری کتاب العیدین)

حضرت حفصہ کا بیان ہے کہ ہم اپنی جوان لڑکیوں کو عیدگاہ میں جانے سے روکتے تھے ایک مرتبہ ایک خاتون قصر بن خلف میں آکر اُتریں اور انھوں نے اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی کے متعلق بیان کیا کہ میرے بہنوئی نے حضور کی معیت میں بارہ غزووں میں شرکت کی اور ہمشیرہ نے چھ جنگوں میں حصہ لیا۔ میری ہمشیرہ کا بیان ہے کہ ہم غزوں میں جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور اُن کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

ربیعہ بنت معوذ ، ام عطیہ - اُم سلیم - اور مالک کی حسب ذیل روایات سے ان امور پر مزید روشنی پڑتی ہے :-

عن الربيع بنت معوذ قالت كنا مع النبى صلى الله عليه وسلم

حضرت ربیعہ بنت معوذ کا بیان ہے کہ ہم مستورات جنگ میں

سقی و نداوی الجرحیٰ
ونرد القتلیٰ الی المدینۃ

یہ خدمت انجام دیتی تھیں۔ زخمیوں
کو پانی پلانا۔ ان کی مرہم پٹی کرنا
اور شہدا کو اُٹھا اُٹھا کر مدینہ
منورہ پہنچانا۔

عن ام عطیہ قالت غزوات
مع رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سبع غزوات
اخلفھم فی رحالھم اصنع
لھم الطعام وا داوی
الجرحیٰ واقوم علی المرضیٰ

حضرت ام عطیہ کا بیان ہے
کہ میں نے حضور کے ساتھ سات
غزوات میں حصّہ لیا میرا کام
یہ تھا کہ مجاہدین کا کھانا پکاتی۔
زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور
مریضوں کی دوا دارو کرتی تھی۔

اتخذت ام سلیم خنجر
ایام حنین فکان معھا
فقال لھا النبی صلی اللہ
علیہ وسلم ماھذا یا
ام سلیم قالت اتخذتہ
ان دنی منی احد من المشرکین
بقرت بطنہ فجعل النبی
صلی اللہ علیہ و سلم
یضحک (مسلم)

جنگ حنین کی تیاری کے
سلسلہ میں حضرت ام سلیم نے
خنجر خریدا اور وہ انھیں کے
ساتھ رہا۔
حضور نے اُسے دیکھ کر فرمایا
کہ ام سلیم یہ کیا۔ انھوں نے
جواب دیا کہ حضور یہ خنجر میں نے
اس لئے لیا ہے کہ اگر کوئی مشرک
بُری نیت سے میرے نزدیک
آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی
حضور جواب سُن کر ہنسنے لگے۔

عن انس بن مالک کان
رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم یدخل علی ام حرام
بنت ملحان وکانت ام
حرام تحت عبادہ بن
الصامت فدخل علیھا
فاطعمتہ وجعلت تفلی راسہ
صلی اللہ علیہ وسلم ثم
استیقظ وھو یضحک قالت
فقلت وما یضحک یا
رسول اللہ قال اناس
امتی عرضوا علی غزاۃ
فی سبیل اللہ یرکبون
ثبج البحر ملوکا علی الا
سرۃ او مثل الملوک
علی الاسرۃ قالت فقلت
یارسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم ادع اللہ ان یجعلنی
منھم فدعا رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم ثم وضع
راسہ ثم استیقظ وھو

حضرت انس کا بیان ہے کہ
حضور مبارک کی عادت تھی کہ
آپ عبادہ بن صامت کی بیوی
ام حرام (جو آپ کی رشتہ دار تھیں)
کے ہاں تشریف لے جاتے تھے
حسب عادت آپ ایک مرتبہ ان
کے یہاں تشریف لے گئے۔ حضرت
ام حرام نے آپ کو کھانا کھلایا
اس کے بعد وہ آپ کے جوئیں دیکھنے
لگیں۔ اسی حالت میں آپ سو
گئے۔ پھر آپ بیدار ہوئے تو
ہنس رہے تھے۔ ام حرام نے
کہا حضور ہنسنے کا کیا سبب ہے
آپ نے فرمایا میری اُمت کے
کچھ آدمی اس حالت میں مجھ پر
پیش کئے گئے کہ وہ شاہانہ
انداز سے بحری سفر میں جہاد
کے لئے جا رہے ہیں۔ میں نے
کہا حضور خدا سے دُعا کیجئے کہ
ان مجاہدین میں میں بھی شامل
ہوں۔ آپ نے ام حرام کی

يضحك فقلت وما يضحك يا رسول الله قال اناس من أمتي عرضوا على غزاة في سبيل الله كما قال في الاول قال في الاول قالت فقلت يا رسول الله ادع الله ان يجعلني منهم قال انت من الاولين فركبت البحر في زمان معاوية بن ابی سفیان فصرعت عن دابتها حين خرجت من البحر فهلكت

(بخاری کتاب الجهاد والسیر)

شرکت کی دعا کی پھر آپ اسی طرح سر رکھ کر سو گئے۔ کچھ دیر بعد پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ میں نے عرض کیا حضور ہنسنے کا کیا سبب ہے آپ نے جس طرح مجاہدین کے دستہ کا پہلے ذکر کیا تھا اسی طرح پھر ذکر کیا میں نے عرض کیا حضور خدا سے دعا کیجئے کہ ان مجاہدین میں میں بھی شامل ہوں۔ آپ نے فرمایا تم پہلے گروہ میں شامل ہو (اور دوسرے گروہ میں شامل نہ ہوسکوگی)۔

حضرت انس کا بیان ہے کہ ام حرام حضرت معاویہ کے زمانہ میں اسی قسم کے مجاہدین کے دستہ میں شامل ہوئیں۔ جب دریا سے نکل کر سواری میں سوار ہوئیں تو سواری سے گر پڑیں اور ہلاک ہوگئیں

جنگ یرموک میں جو خلافت فاروقی ہوئی تھی حضرت اسماء بنت ابو بکر حضرت ام ابان اُم حکیم، خولہ، ہند اور ام المومنین حضرت جویریہ نے بڑی دلیری سے جنگ کی تھی۔ اور اسماء بنت یزید نے جو انصار کے قبیلہ سے تھیں خیمہ کی چوب سے ۹ رومیوں

کو قتل کیا۔ نہ صرف برّی بلکہ بحری لڑائیوں میں بھی صحابیات شرکت کرتی تھیں۔ چنانچہ اوپر گزرچکا ہے کہ ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص پر حملہ ہوا تو حضرت ام حرام بھی اس میں شامل ہوئیں۔ غرض کہ تاریخ اسلام سے عورتوں کا جنگ میں شرکت کرنا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا۔ پانی پلانا چرخہ کاتنا، تیر اٹھاکر دینا۔ قبر کھودنا اور فوج کو ہمت دلانا ثابت ہے اب سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب کہ جنگ کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے اور اس کے لئے کافی عرصہ پہلے سے قوموں کو تیاری کرنی پڑتی ہے۔ مسلمان عورتیں کیونکر قومی دفاع کے کاموں اور متعلقہ صنعتی مشاغل میں حصہ لے سکتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ زمانہ حال میں جنگ کے لئے کم ازکم چندسال پہلے سے آبادی کو تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ وقت آنے پر قومی دفاع کا فریضہ ادا کر سکے۔ اسی طرح جنگی صنعتوں کو بھی ترقی دینی پڑتی ہے اور ان کے مئے کارکنوں اور صناعوں کی تربیت کا ایک وسیع خاکہ تیار کرنا پڑتا ہے جس کے تحت صنعتی مدارس دفاعی تربیت گاہیں۔ طبی امداد کی تعلیم اور دیگر قسم کی فنی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ عہد رسالت میں چونکہ تہذیب و تمدن کی وسعت اور پیچیدگی کا یہ حال نہیں تھا اور عورتیں بغیر کسی قبل از قبل تیاری کے ان کاموں میں حصّہ لے سکتی تھیں اس لئے جدید طرز کی جنگی اور دفاعی تربیت میں عورتوں کے حصّہ لینے کا ذکر روایتوں میں نہیں آتا ہے اگر زمانہ رسالت میں بھی جنگیں اسی پیمانہ پر لڑی جاتیں جیسے آج کل اور ان کے لئے اسی درجہ میں فنی مہارت اور تربیت کی ضرورت ہوا کرتی تو یہ امر یقینی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو

حکم دیتے کہ وہ کارخانوں، تعلیم گاہوں اور تربیت گھروں میں جاکر قومی اور مذہبی دفاع کے لئے تیار ہوں۔ لہٰذا اس زمانہ میں عورتوں کا ان کاموں میں شرکت کرنا نہ صرف قابل اعتراض نہیں بلکہ اسلامی احکام کی رو سے ضروری ہے

البتہ ہمیں ان کاموں میں عورتوں کو داخل کرتے وقت دو امور کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ اولاً یہ کہ عورتوں مردوں میں بلا ضرورت اختلاط نہ ہونے پائے۔ یعنی عورتوں کی تربیت گاہیں، مدارس اور دفاعی تیاریوں کے مرکز بالکل علیحدہ ہوں اسی طرح اگر عورتوں کے لئے کارخانے الگ نہ بنائے جاسکیں تو کم ازکم ہر کارخانے میں عورتوں کا شعبہ بالکل جدا ہو اگر عورتوں کی تربیت اور فنی تعلیم کے لئے مردوں کے خدمات بالکل ناگزیر ہوجائیں تو اس کے لئے ایسے معلمین اور تربیت کنندوں کا انتخاب کیا جائے جو چالیس کی عمر سے زیادہ ہوں۔ جب یہ لوگ کافی تعداد میں عورتوں کو تعلیم و تربیت دیدیں تو پھر مزید فنی تعلیم اور جنگی تربیت کے لئے مردوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی ۔ دوسرا امر یہ ہے کہ عورتوں سے یہ کام ہمہ وقتی اساس پر نہ لیا جائے بلکہ دن یا رات کے کسی خاص حصوں میں چند گھنٹوں کے لئے انھیں اس کام کے لئے بلایا جائے تاکہ وہ گھریلو امور اور ذمہ داریوں سے بالکل غافل نہ ہو سکے پائیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے تقاضوں کو پورا کرتی رہیں۔ اس طرح قرآن کا یہ حکم برقرار رہے گا۔

وقرن فی بیوتکن   اور گھروں میں ٹھہری رہو۔

یعنی درون خانہ زندگی کی اہمیت کو نظرانداز نہ کرو۔

تعدد ازدواج

تعدد ازدواج کے مسئلہ پر اسلام کے خلاف مغربی مفکرین نے بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں۔ ان لوگوں کا اسلام پر اعتراض یہ ہے کہ اس نے تعدد ازدواج کی اجازت دیکر نفس پرستی اور شہوانیت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس تنقید و تعریض سے متاثر ہو کر خود مسلمانوں کے بعض اہل فکر بھی تعدد ازدواج کی اجازت پر معترض ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت مشروط طور پر دی تھی اور جس زمانہ میں یہ اجازت دی گئی اس میں کفار سے لڑائیوں کا ایک طول طویل سلسلہ جاری تھا جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ تھا کہ مردوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ عورتوں کی فاضل آبادی کو اگر یوں ہی بے بس چھوڑ دیا جاتا تو مسلمانوں کی سوسائٹی میں جنسی خواہش کی کثرت ہو جاتی اور مردوں عورتوں کی اخلاقی حالت میں نمایاں انحطاط واقع ہوتا۔ اس لئے مسلمانوں کو زناکاری اور فواحش سے محفوظ رکھنے اور بیوہ عورتوں کی معاشی کفالت کا انتظام کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ مردوں کو ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے علاوہ عرب میں اسلام سے پہلے تعدد ازدواج کی رسم جاری تھی اور اس پر کوئی قید یا تحدید نہ تھی بلکہ ہر شخص کو قانوناً اور رسماً اس بات کی اجازت تھی کہ جتنی بیویاں چاہے نکاح میں لے آئے۔ ایک ایسی قدیم رسم کو جس کی جڑیں عربوں کی معاشرت اور

تاریخ میں پیوست تھیں بالکلیہ مٹا دینا ممکن نہ تھا بالخصوص جبکہ اس کے معاشی نتائج بھی دوررس ہوتے۔ اس لئے جیسا کہ غلامی کے مسئلہ میں اسلام نے تدریج سے کام لیا۔ اسی طرح تعدد ازدواج کے مسئلہ میں بھی اُس نے احتیاط اور آہستگی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ پہلے اسلام نے تعدد ازدواج کو صرف چار بیویوں تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد ایک مزید شرط یہ لگائی کہ دوسری شادی اسی صورت میں جائز ہے جبکہ ازدواج کے مابین نان و نفقہ اور عام سلوک میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ اگر مرد یہ محسوس کرے کہ وہ اپنی بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتا تو اسے صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

جن عیسائی مصنفین نے اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ تعدد ازدواج کی اجازت دیکر نفس پرستی اور شہوت رانی کے دروازے کھول دیتا ہے اُنھوں نے غالباً اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ خود عیسائی مذہب نے تعدد ازدواج کی صریحاً ممانعت نہیں کی۔ عہد نامہ جدید میں ایک شادی کرنے کو پسندیدہ فعل تو ضرور قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسا قفہ کے اور کسی عیسائی کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی ممانعت نہیں کی گئی۔ تعدد ازدواج کے مخالفین اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ عیسائیت کو ایسا کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس نہیں ہوئی کہ جن لوگوں میں اس مذہب کی تبلیغ کی گئی ان میں یہ رسم رائج ہی نہ تھی لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ عیسائیت کے اولیں مخاطب یہود تھے جو پہلی صدی عیسوی میں تعدد ازدواج کی رسم پر عامل تھے۔ بعض عیسائی علماء نے یہودی علماء اور احبار کو اس بنا پر مطعون کیا کہ وہ

ایک سے زائد شادیاں کرتے تھے لیکن ابتدائے عیسائیت کے بعد کئی سو برس تک کلیسا کی کسی مجلس نے تعدد ازدواج کی مخالفت نہیں کی اور کئی عیسائی بادشاہوں نے علانیہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھیں لیکن کلیسا نے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چنانچہ شارلمیں نے دو عورتوں سے بیک وقت نکاح کرنے کے علاوہ کئی ایک داشتہ عورتیں رکھ چھوڑی تھیں اور اس کے قوانین کے منجملہ ایک قانون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کی رسم عیسائی ممالک میں بالکل ناپید نہ تھی۔

جدید یوروپ کے کئی ایک مفکرین اور علمائے عمرانیات نے بھی تسلیم کیا ہے کہ تعدد ازدواج کا طریقہ اتنا لائق نفرت نہیں اور نہ اس سے کچھ ایسی بڑی خرابیاں واقع ہوتی ہیں جن کی بنا پر اسے بالکل مردود قرار دیا جائے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ بعض حالات میں تعدد ازدواج نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران میں انگلستان میں کئی بار یہ تجویز پیش کی گئی کہ قتل اولاد اور زناکاری کو رد کرنے کے لئے تعدد ازدواج کو قانوناً جائز قرار دے دیا جائے۔ ہیو یلاک ایلس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جیمس ہنٹن نے کئی بار اس خیال کا اظہار کیا کہ اگرچہ توحد ازدواج (ایک بیوی کرنا) بڑا پسندیدہ فعل ہے بشرطیکہ وہ انسان کی اپنی آزاد مرضی کا نتیجہ ہو لیکن قانون کی رو سے اس کو ضروری قرار دینا صحیح نہیں۔ چنانچہ ہنٹن لکھتا ہے ہم نے توحد ازدواج کو ایک عالمگیر قانون کی شکل دیکر اتنی جنسی بدعنوانیاں پیدا کردی ہیں کہ علانیہ طور سے تعدد ازدواج کا طریقہ رائج کرنے میں فواحش کا یہ سیلاب ہرگز

نہ پھوٹتا۔ جبری تو حد ازدواج پیشہ ورانہ عصمت فروشی کی تمام خرابیوں کا موجب ہے۔ اس سے میاں بیوی میں نفرت اور حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بیوی کو اصرار رہتا ہے کہ شوہر نکاح کے اس پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دے جو جسمانی تعلق پر مبنی ہوتا ہے۔ اس طرح زن و شوہر کے تعلقات میں فطری محبت کی جگہ تصنع کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ عورت کے اندر رشک و حسد کا جذبہ اس سے نہیں پیدا ہوتا کہ اس کا شوہر دوسری عورتوں سے کیوں محبت کرتا ہے بلکہ اس کا محرک یہ خوف ہوتا ہے کہ مبادا وہ اسے بالکل بے سہارا چھوڑ کر الگ نہ ہو جائے"

ویسٹرمارک نے "مغربی تہذیب میں ازدواجی زندگی کا مستقبل" ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ کئی مصنفوں کی تحریروں کا حوالہ دیتا ہے جو اس بات کے حامی ہیں کہ متعدد وجوہ کی بنا پر تعدد ازدواج کو قانوناً جائز قرار دینا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے "ڈاکٹر کوپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ فریقین کے راضی ہونے کی صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت دے دی جائے۔ اس کا خیال ہے کہ معمولی حالات میں بہت کم اشخاص اس اجازت سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن بعض صورتوں میں تعدد ازدواج جائز قرار دینے سے عورتوں اور مردوں کی مشکلات دور ہو جائیں گی مثلاً اگر مرد یا عورت دائم المریض ہو یا کسی مزمن بیماری میں مبتلا ہو تو تعداد ازدواج کی اجازت دونوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر شوہر اور بیوی لاولد ہوں تو بھی تعدد ازدواج ان کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوگا۔ ان صورتوں کے علاوہ اور کئی صورتیں بھی پیش آ سکتی ہیں جن میں ایک سے زائد بیویاں کرنے

کی اجازت ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر کوپ نے تمام امور کو ملحوظ رکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ تعدد ازدواج پر کوئی پابندی نہ عائد کی جائے۔ اسی طرح مسٹر سدرن کی رائے یہ ہے کہ اگر لوگوں کی اکثریت ایک سے زائد بیویاں کرنے کو ناپسندیدہ فعل قرار دیتی ہے اور ایک نکاح پر قانع رہنے کو بہتر سمجھتی ہے تو اس سے حکومت اور اسٹیٹ پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اکثریت کی رائے کو بزور قانون ساری آبادی پر نافذ کرے۔ اگر کچھ لوگ شادی بیاہ کے دوسرے طریقے پسند کریں اور باہمی رضامندی سے ان طریقوں پر عمل پیرا ہوں تو اسٹیٹ کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ انہیں روک دے بشرطیکہ ان کے پسندیدہ طریقوں سے اولاد کا مستقبل خراب نہ ہو۔ ڈاکٹر نارمن ہیر کی رائے یہ ہے کہ اگر تعدد ازدواج کو قانوناً جائز قرار دیا جائے تو اس سے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو فائدہ پہونچے گا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کا انتظام اسٹیٹ اپنے ذمہ لے لے تو بیویوں کی تعداد پر قانوناً کوئی حد نہیں لگانی چاہئے۔ پروفیسر ڈن لاپ کا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں کو ایک شادی کر کے جنسی اور روحانی تشفی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو اگر ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت دی جائے تو ان کی جذباتی زندگی میں سکون و طمانیت پیدا ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ مستقبل کے نظام ازدواج میں مردوں اور عورتوں کو مکمل آزادی ملنی چاہئے کہ وہ جس قسم کے ازدواجی تعلقات چاہیں قائم کریں ڈاکٹر لی بان جیسے عالم

نے پیش گوئی کی ہے کہ فرانس میں آئندہ چل کر تعدد ازدواج کو قانوناً تسلیم کرلیا جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ تعدد ازدواج سے بہت سی معاشرتی خرابیاں رفع کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً پیشہ ورانہ عصمت فروشی، امراض خبیثہ، اسقاط حمل، ناجائز بچوں کے مصائب اور ان ہزاروں لاکھوں عورتوں کی تکالیف جو مردوں کی آبادی میں کمی کے باعث غیر شادی شدہ رہنے پر مجبور ہیں۔ یہ سب خرابیاں رفع ہوجائیں گی اگر تعدد ازدواج کی اجازت دیدی جائے اسی طرح زناکاری اور جنسی رشک و حسد کا بھی خاتمہ ہوسکتا ہے کیونکہ عورت کو مرد کی کھلم کھلا غفلت اور بے توجہی سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس خیال سے کہ اس کا شوہر پوشیدہ طور سے دوسری عورتوں کے ساتھ معاشقانہ تعلقات رکھتا ہے۔ تعدد ازدواج کا سب سے زیادہ پُرجوش حامی پروفیسر کرسچین فان ایرن فلس ہے جو اس طریقہ ازدواج کو آریائی نسل کی بقا کے لئے ضروری سمجھتا ہے"

ان مندرجہ کے خیالات پیش کرنے کے بعد ویسٹر مارک خود ان وجوہ پر بحث کرتا ہے جن کی بنا پر تعدد ازدواج کی حمایت کی جاتی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اگرچہ جدید تہذیب کے ماتحت تعدد ازدواج کی اجازت دیدی جائے تب بھی اس کے رواج اور وسعت پذیری کا دارومدار اس پر ہوگا کہ عورتوں کے احساسات اس کے بارے میں کیا ہیں۔ پھر وہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر شادی کی عمر بیس سال سے پچاس سال تک مقرر کی جائے تو عورتوں اور مردوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے چار

فیصد عورتوں کو تجرد کی زندگی گزارنی پڑتی ہے کیونکہ ہمارے یہاں تعدد ازدواج کو قانوناً ممنوع کر دیا گیا ہے ۔ اب اگر ولیسٹر مارک کا یہ خیال صحیح ہے کہ ایک سے زائد شادیاں کرنے کو قانوناً ممنوع کر دینے سے چار فیصد عورتیں بے نکاحی رہ جاتی ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ تعدد ازدواج نہ صرف جائز بلکہ معاشرتی سود و بہبود کے لئے ضروری ہے بشرطیکہ ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج زیادہ وسیع پیمانہ پر نہ ہو کیونکہ عورتوں کی فاضل آبادی کو با عزت معاشرتی زندگی میں جذب کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر تعدد ازدواج کا طریقہ زیادہ پھیل جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتوں کی فاضل آبادی کی جگہ مردوں کی فاضل آبادی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا، کیونکہ بہت سے مرد ایسے رہ جائینگے جن کو باوجود تلاش کے کوئی عورت نکاح کے لئے نہ ملے گی ۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کے وسیع پیمانہ پر رواج کے وسیع پیمانہ پر رواج پانے کے امکانات بہت کم ہیں ۔ چنانچہ اس بارے میں ہیولیک ایلس اپنی کتاب نفسیات جنسی میں لکھتا ہے :-

"چونکہ مردوں اور عورتوں کی تعداد کم و بیش ہر زمانہ میں مساوی رہتی ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ہر مرد کو دو بیویاں نصیب ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں تعدد ازدواج رائج ہے وہاں بھی صرف ایک محدود مگر خوش حال طبقہ کے لوگ اس رواج سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ ہماری تہذیب میں چند مستثنیٰ اشخاص کو چھوڑ کر کوئی مرد ایک سے زائد بیویاں

کرنا چاہتا ہے۔ بہت سی مجبوریاں اور مشکلات ایسی ہیں جن کی وجہ سے اکثر مرد دو شادیوں سے گھبراتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے تو یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ دو مردوں کے تحت دو مختلف گھر چلائیں۔ اس لئے انھیں تو لازماً ایک ہی مرد پر قناعت کرنی پڑتی ہے،، ویسٹرمارک کے بیان سے بھی ہیو یلاک ایلیس کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ ویسٹرمارک لکھتا ہے "اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کبھی تعدد ازدواج کو قانوناً جائز کر دیا جائے تو مرد کثیر تعداد میں اس اجازت سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ برناڈ شا کا یہ خیال عجیب و غریب ہے کہ چونکہ تعدد ازدواج کی اجازت سے طاقتور اور صحت مند مردوں کو عورتوں کی ایک بڑی تعداد کا اجارہ مل جائے گا اس لئے بہت سے مرد تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور وجوہات سے قطع نظر کر کے گھریلو جھگڑوں کا خوف و اندیشہ اور ایسی عورتوں کی تلاش میں دشواریاں جو دوسری عورتوں کے ساتھ ازدواجی زندگی میں شرکت منظور کریں مردوں کی ایک بڑی تعداد کو اس حق کے استعمال سے روک دیں گی۔ اس کے علاوہ معاشی حالات کا بھی تعدد ازدواج کی رسم کو محدود کر دینے میں بڑا زبردست حصہ ہوتا ہے۔ جن قوموں اور تہذیبوں نے تعدد ازدواج کی اجازت دے رکھی ہے ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ بالعموم ایک بہت ہی مختصر اقلیت اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں مردوں کی بہت بڑی اکثریت ایک ہی بیوی پر قناعت کرتی ہے۔

میک گریگر کے مشاہدات کی رو سے ایران میں صرف دو فیصد اشخاص ایک سے زائد نکاح کرتے ہیں۔ ۱۹۰۷ء کی ایک رپورٹ کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر ایک ہزار شوہروں کی ایک ہزار بیویاں ہوتی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی مرد کی دو سے زائد بیویاں نہ ہوں تب بھی ہزار میں صرف اکیس مسلمان مرد تعدد ازدواج کے طریقہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔"

تعدد ازدواج کے جواز کی ایک وجہ ویسٹر مارک نے یہ بتائی ہے کہ دوران حمل میں مردوں کو بیویوں سے الگ رہنا پڑتا ہے۔ بعض لوگ زمانہ حمل میں جماع کو عورت اور بچے کی صحت کے لئے مضرت رساں خیال کرتے ہیں اور بہت سی عورتیں اس زمانہ میں جماع کی خواہش سے یا تو بالکل خالی ہو جاتی ہیں یا اُن کی خواہشات میں نمایاں طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے چنانچہ ویسٹر مارک لکھتا ہے کہ ڈاکٹر ہملٹن نے (۸۱) عورتوں سے زمانہ حمل کی حالت کے بارے میں استفسار کیا۔ ان میں سے ۴۲ عورتوں نے جواب دیا کہ اس حالت میں انھیں خواہش جماع یا تو محسوس نہیں ہوتی یا بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ ان باتوں کے باوجود ویسٹر مارک کا خیال ہے کہ تعدد ازدواج کے جواز کی محض یہ وجہ کافی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ہمارے یہاں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ حمل کے دوران میں لوگ جماع سے بالکلیہ پرہیز کریں اور ترک جماع کو تعدد ازدواج کی کافی سبب قرار دینا صحیح نہیں ہے ویسٹر مارک کی اس رائے سے اتفاق کرنے کے باوجود ہمیں ماننا پڑے گا کہ انفرادی حالات میں یہ ممکن ہے کہ بعض اشخاص زمانہ حمل میں ترک جماع پر مجبور

ہوں ۔ ایسی صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ اُنھیں دوسرے نکاح کی اجازت دی جائے۔

ولیسٹر مارک نے تعدد ازدواج کی ایک اور معقول وجہ بھی بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورتوں کے برعکس مردوں میں تعدد ازدواج کی طرف ایک جبلی رجحان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مردوں میں ذواقیت یعنی جنسی تجربات میں تنوع کی خواہش بکثرت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رابنسن کا حوالہ دیکر ولیسٹر مارک اس کی یہ رائے نقل کرتا ہے کہ مرد فطرتاً تنوع پسند ہے اور بیشتر مردوں کے لئے ایک بیوی پر قناعت کرنا دشوار اور بعض صورتوں میں ناممکن ہے۔ اس کے بعد وہ مائیکل کا ایک اقتباس پیش کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "ہمیں اس امر کا کامل یقین ہے کہ دنیا میں ایک مرد بھی ایسا نہیں خواہ وہ کتنا ہی پارسا اور عفت پسند ہو جس نے کم سے کم خواب وخیال کی دنیا میں ایک سے زائد عورتوں سے محبت نہ کی ہو۔ اس حقیقت کی طرف بے شمار مصنفین اور ماہرین جنسیات نے توجہ دلائی ہے۔ جو ہیجات اور محرکات انسان کے جنسی جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ مردوں میں اُن کی تعداد اتنی کثیر اور اُن کے اقسام اتنے متنوع ہیں کہ کسی عورت کے لئے ایسے شہوانی محرکات سے متاثر ہونا محال ہے"

ڈاکٹر فورل ہمیں لکھتا ہے "جونہیں کوئی مرد اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کر لیتا ہے وہ فوراً دوسرے جنسی تجربات کی طرف لپکنا چاہتا ہے۔ اس کے برخلاف عورت جس مرد سے لذت حاصل کرتی ہے اُسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتی"۔ فورل کی رائے میں عورت

اپنی محبت میں بڑی احتیاط برتتی ہے اور بہت دیکھ بھال کر اپنی جنسی محبت کا مرکز تلاش کرتی ہے۔ برخلاف اس کے مرد تقریباً ہر جوان عورت سے لطف اندوزی کی طرف مائل رہتا ہے اور اپنے انتخاب میں اتنا زیادہ محتاط اور باریک بین نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ عورت جنسی نقطۂ نظر سے زیادہ مستقل مزاج ہوتی ہے اور شاذ و نادر ہی اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی مردوں سے جنسی لطف اندوزی کی خواہش کرے۔ جارج برنھڈ کی رائے بھی یہی ہے۔ ماسکو یونیورسٹی کی (۳۲۴) لڑکیوں میں سے صرف ۳ لڑکیوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بہ یک وقت دو مردوں سے محبت کر سکتی ہے۔ کش کہتا ہے "نوجوان مرد جنسی فتوحات کی آرزو میں ایک دو نہیں کئی عورتوں کے تصور سے سرشار رہتا ہے لیکن عورت کا دل حالت بلوغ میں صرف ایک محبوب مرد کے خیال سے لبریز ہوتا ہے" کش کی رائے میں عورتوں کے جنسی توحد کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی محبت میں روحانی عناصر غالب ہوتے ہیں۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ مرد فطرتاً تعدد ازدواج کی جانب مائل ہے تو ازدواجی قانون کی تدوین میں اس امر کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے تاکہ جن مردوں میں جنسی جذبہ غیر معمولی طور پر طاقتور ہو اُن کے لئے ایک سے زائد نکاح کی گنجائش رہے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے مرد ناجائز جنسی تعلقات قائم کریں گے۔ جس معاشرہ میں تعدد ازدواج کو بالکل روک دیا گیا ہو اس میں خاندانی ابتری اور عائلی انتشار کے پیدا ہونے کا قوی احتمال رہے گا کیونکہ ناجائز جنسی تعلقات کی کثرت ہوگی

اس میں شک نہیں کہ اسٹیٹ کو اس بارے میں مداخلت کا حق ہونا چاہئے اور وہ تعدد ازدواج پر کڑی پابندیاں لگا سکتی ہے لیکن اسٹیٹ کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اس طریقہ کو بالکلیہ مسدود کردے۔ تعدد ازدواج کی ضرورت اس لئے بھی رہے گی کہ بہت سی عورتیں فطرتاً اس قدر سرد مزاج ہوتی ہیں کہ وہ مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل سے قاصر رہتی ہیں۔

مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر جن میں سے بعض کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اسلام نے تعدد ازدواج کی رسم کو یک لخت ممنوع قرار دینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اس نے بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں لانے کی اجازت نہیں دی اور ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ نان و نفقہ اور عام سلوک میں ایک بیوی اور دوسری بیوی کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے :-

وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ اوما ملکت ایمانکم	لیکن اگر تمہیں خوف ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا ان عورتوں سے تمتع کرو جو تمہارے ہاتھ کے نیچے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا محمد علی اپنے ترجمہ قرآن میں لکھتے ہیں:

"یہ الفاظ اسلام میں مسئلہ تعدد ازدواج کی بنیاد ہیں۔ الفاظ

صریحًا ایسے تھے کہ نہ مخالفین کو اعتراض کا موقعہ تھا نہ موافقین کو غلطی لگ سکتی تھی۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ایک طرف مخالفین نے مشہور کر رکھا ہے کہ گویا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نکاح میں کئی بیویاں ہوں۔ بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے اسے حکم قرار دیا ہے اور یوں اس کی تاویل کرلی ہے کہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ چار بیویاں ہوں ورنہ تین ورنہ دو۔ سوالات غور طلب اس مسئلہ میں یہ ہیں کہ کیا ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا حکم ہے یا اجازت کیا اجازت ضرورت کے لئے ہے یا بلا ضرورت بھی ایک سے زیادہ بیویاں نکاح میں لائی جاسکتی ہیں۔ کیا اگر قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے کہ بوقت ضرورت تعدد ازدواج کی اجازت ہے تو اس مسئلہ پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ کہ آیا ضرورت کے ہوتے ہوئے چار سے زیادہ بیویاں نکاح میں لانا جائز ہے

سب سے پہلے دیکھنا ہے کہ یہ حکم ہے یا اجازت۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیویوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکنے کا خوف ہے۔ پس اول تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لئے ہوئی جن کو یتامیٰ کی خبرگیری سے تعلق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کے حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے۔ دوسرے یہ بے معنی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تم کو یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکنے کا خوف ہو تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ دو یا تین یا چار بیویوں سے نکاح کرلو۔ پھر جس قدر توجیہات الفاظ ان خفتم الا تقسطوفی الیتمیٰ کی گئی ہیں یا کی جاسکتی ہیں۔ ان سب سے

یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ کہ حکم۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ تعدد ازدواج کی اجازت ہے حکم نہیں ہے تو دوسرا امر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اجازت ضرورت کے وقت استعمال کرنے پر ہے یا بلا ضرورت بھی، سو اول تو لفظ اجازت خود بتاتا ہے کہ یہ صرف ضرورت کے لئے ہے کیونکہ ہر ایک اجازت دنیا میں کسی ضرورت ہی کے لئے ہوا کرتی ہے۔ دوسرے خود قرآن کریم کے الفاظ اس بات کے لئے موید ہیں کیونکہ وہاں خود ایک شرط لگا دی گئی ہے۔ گویا ایک ضرورت خود بتا دی۔ اب ضرورت میں توسیع تو ہوسکتی ہے۔ یعنی جو کام ایک ضرورت کے لئے جائز ہے اس کا جواز اجتہادی رنگ میں کسی دوسری ملتی جلتی ضرورت کے لئے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت کو بالکل اڑا دیا جائے۔

ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ان ضروریات کی تصریح کیوں نہیں فرما دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے جو ملکوں اور قوموں اور زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتے رہتے ہیں، وہاں قرآن کریم ان ضروریات کو گننے کی لا حاصل کوشش سے احتراز فرماتا ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضروریات کے وقت طلاق دینا جائز ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی بین امر ہے کہ طلاق کی اجازت ضرورت کے لئے دی ہے نہ بلا ضرورت لیکن چونکہ طلاق کے لئے جو ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ صرف انسانوں کے مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ بدلتی

رہتی ہیں بلکہ قومی اور ملکی اور زمانی حالات کے تغیر سے بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان کا تبانا ایک لاحاصل کام تھا ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک میں جہاں سب قوموں کا ایک ہی مذہب ہے ایک سی تعلیم ہے ایک سے خیالات ہیں کوئی دو ملک ضروریات طلاق پر اتفاق نہیں کرتے۔ اسی طرح تعدد ازدواج کی ضروریات کو خاص کرنا محال ہے۔

اب تیسری بات جس پر ہمیں غور کرنا ہے یہ ہے کہ آیا جس صورت میں قرآن کریم نے تعدد ازدواج کی اجازت ضرورت کے وقت دی ہے تو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اس بات سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ ہر ایک قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اسلام نے ان ضروریات کا علاج تعدد ازدواج کی صورت میں رکھ دیا۔ دوسری قوموں نے اس کے لئے طرح طرح کے اور طریق اختیار کئے۔ حتی کہ بعض ملکوں میں قانوناً زنا کے پیشہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور بعض نے اس کو اس حد تک رواج دیا کہ قانونی جواز سے اس کا کچھ کم مرتبہ نہیں رہا۔ اسلام چونکہ عورت کی عزت و عفت کا حامی ہے اور اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں پیسوں کے عوض اپنی عفت کو فروخت کریں۔ اس لئے تعدد ازدواج کی صورت میں ان تمام مشکلات کو حل کردیا ہے۔ پھر علاوہ دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ وہ بعض حالات میں تعدد ازدواج پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کا سلسلہ دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور جنگوں

میں مردوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہے۔ اب چونکہ قدرتی
حالت جس میں انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ مرد و عورت کے
باہمی تعلق کی حالت ہے اور اسی پر نسل انسانی کی ترقی موقوف
ہے اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر ایک مرد اور ہر
ایک عورت اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ اب اگر مردوں کی تعداد
عورتوں سے زیادہ ہے تو چونکہ بچہ کا پیٹ میں رکھنا جننا پرورش
کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہے اس لئے نسل انسانی کا ہر
ایک فرد جسے ممکن طور پر یہ موقعہ ہے اس فرض کو ادا کرسکتا ہے
اور جو مرد بلا بیویوں کے رہ جائیں گے وہ کسی صورت میں
نسل انسانی کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عورتوں کی
تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور یہی وہ صورت ہے جو
جنگوں اور مردوں کی دوسری ضروریات کی وجہ سے اکثر حالات
میں دنیا میں پیش آتی رہتی ہے تو جو عورتیں بلا خاوندوں کے
ہوں گی وہ نسل کی ترقی میں صرف ازدواج کے ذریعہ سے
معاون ہو سکتی ہیں۔ گویا اس صورت میں تعدد ازدواج ایک
قومی فرض ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں جب پہلے ہی
آبادی کم ہو جاتی ہے ان عورتوں کو خاوندوں کے بغیر چھوڑنا
گویا عمداً نسل انسانی کی افزائش کی راہ کو روکنا ہے۔ اس کے
علاوہ عموماً عورتوں کی معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے
پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم رہ جاتی ہیں
ان کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ

وہ ان کی خبرگیری اور پرورش کریں اور اس کے لئے ایک ہی راہ ہے جو قدرت نے رکھی ہے یعنی اُن کو نکاح میں لے آنا یورپ بے شک تعدد ازدواج کا منکر ہوا ہے۔ لیکن خدا ئے تعالیٰ نے یورپ پر اتمام حجت بھی نہایت بین طور پر کیا ہے۔ کیونکہ وہاں باوجود امن کے عورتوں کی تعداد مردوں سے مدت سے بڑھی ہوئی چلی آتی ہے اور پچھلی باہمی جنگ نے اور بھی مردوں کی تعداد کو کم اور عورتوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔ آخر عقلمند غور کریں گے کہ جس صورت میں نسل انسانی کی افزائش کو جنگ سے سخت نقصان پہونچا ہے اور پیچھے عورتیں کثرت سے موجود ہیں جو اگر خاوندوں کے گھروں میں ہوں خواہ ایک خاوند کے گھر میں دو دو، تین تین۔ چار چار عورتیں ہی کیوں نہ ہوں نسل انسانی کی افزائش کا موجب ہو سکتی ہیں تو یہ کس قدر دور اندیشی سے بعید ہے کہ ایک فرضی روک پیدا کر کے نسل انسانی کی افزائش کو اس طرح جنگ کے ساتھ یہ دوسرا صدمہ پہونچایا جائے یا دوسری صورت یہ ہوگی کہ ناجائز تعلقات سے بچے پیدا ہوں جو نہ صرف سوسائٹی اور قوم کے لئے ننگ و عار کا موجب اور ماؤں کے پرلے درجے کی ذلت کا باعث ہوں۔ بلکہ ان کی خبرگیری کا بھی کوئی اہتمام نہ ہونے کے باعث وہ حقیقی طور پر قوم کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے اور چونکہ ان کا کوئی کفیل نہ ہوگا اس لئے ان میں سے کثرت کے ساتھ بلوغت کو پہونچنے سے پہلے ہی دنیا سے اُٹھ جائیں گے عقلمند انسان کا

یہی کام ہے کہ فرضی اور وہمی رکاوٹوں پر وہ غالب آجاتے ہیں۔ اسی طرح یوروپ کے عقلمند مجبور ہوکر اس امر کو قبول کرلیں گے کہ واقعی بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قومی ہوجاتا ہے بلکہ اب بھی جب کہ ایک خطرناک عالمگیر جنگ نے یوروپ کے بے شمار مردوں کو خاک کے نیچے سلا دیا ہے ایک قوم اس بات پر بحث کر رہی ہے کہ موجودہ حالات کے تحت سوائے تعدد ازدواج کے قوم کے تباہ ہوجانے کا خطرہ ہے۔ خود انگلستان میں ہر سو مردوں کے لئے ایک سو دس عورتیں ہیں۔

اس ہدایت کا منجانب اللہ ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی الہامی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو اور ہر قوم کے بڑے بڑے مقدس اور برگزیدہ لوگوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں پائی جاتی ہیں حالانکہ اگر تعدد ازدواج جائز نہیں تو پھر یہ زنا ہے اور یہ کبھی وہم میں نہیں آسکتا کہ تمام قوموں کے مقدس بزرگ نعوذ باللہ من ذالک ایک ایسے امر کا ارتکاب کرتے تھے۔ وہ جنھوں نے اللہ کی رضا کے لئے سب کچھ دیدیا وہ ایک امر فاحش کا ارتکاب کبھی نہ کرسکتے تھے۔ پھر جب سب الہامی کتابوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ گناہوں سے روکا تو کسی کتاب نے تعدد ازدواج سے کیوں نہ روکا۔

خود انجیل باوجود اس کے کہ اس وقت یہودیوں میں تعدد ازدواج پر عمل ہوتا تھا ایک حرف اس کے خلاف نہیں

کہتی ہاں پولوس کی تعلیم میں صرف پادریوں کو یہ ہدایت ہے کہ ایک بی بی پر قناعت کریں عوام کو پھر بھی اجازت رہی۔

اس دواکو تجویز کرتے ہوئے اسلام نے دو اور روکیں ایسی تجویز کردی ہیں کہ حد اعتدال سے اس کا استعمال نہ بڑھ جائے وہ دو روکیں یہ ہیں کہ اول تو چار تک حد بندی کردی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چار کی حدبندی کوئی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک تو اجازت دیتے ہوئے ایک خاص عدد پر بس کردینا خود اس اجازت کو آخری حد بتاتا ہے۔ دوسرے قال اس پر شاہد ہے۔ تیسرے بعض روایات سے یہی گواہی ملتی ہے۔ مثلاً نوفل بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیویاں تھیں۔ نبی کریم صلعم نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دیدو۔ یا غیلان بن سلمہ ایمان لائے اور ان کی دس بیویاں تھیں تو نبی کریم صلعم نے چار کو رکھ کر باقی کو طلاق کا حکم دیدیا اور اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، دارقطنی اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے کہ عمیرۃ الاسدی ایمان لائے تو آٹھ عورتوں کے خاوند تھے۔ نبی کریم صلعم نے چار رکھ کر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ باقی رہا نبی کریم صلعم کی بیویوں کا معاملہ سو چونکہ یہ مضمون بطور خود علیحدہ بحث چاہتا ہے اس لئے اس پر سورہ احزاب میں مفصل بحث ہوگی جہاں یہ ذکر ہے۔ یہاں اس قدر بتا دینا کافی ہوگا کہ نبی کریم کو بھی یہ

حکم ہوا تھا کہ وہ اور بیویاں نکاح میں نہ لائیں بلکہ جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں اُن کو طلاق دیکر ان کی جگہ اور شادی کرنے سے بھی روکا گیا تھا۔ "لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج" اس لئے آپ کو یہ حکم نہ ہوا تھا کہ چار رکھ کر باقی کو طلاق دیدیں۔ دوسری روک جو تعدد ازدواج کے مسئلہ پر قرآن نے ڈالی ہے وہ عدل کا قائم رکھنا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ اگر ضرورت بھی پیدا ہو مگر ایک شخص دو بیویوں میں عدل قائم نہیں رکھ سکتا تو پھر ایک شوہر اور ایک بی بی کے اصول ہی پر عمل کرے۔ اس سے دو کھلے نتائج اخذ ہوتے ہیں اول یہ کہ ایک شوہر اور ایک بیوی کا اصول ہی نکاح میں اصل الاصول ہے اور یہ ایک ایسا مستحکم اصول ہے کہ گو ضروریات بھی دوسرے رنگ کی پیدا ہو جائیں جو تعدد ازدواج کو ضروری ٹھہرا دیں تاہم اگر ایک شخص صرف اس بات پر قادر نہیں کہ وہ دو بیویوں میں عدل قائم رکھ سکے تو بھی وہ ایک بی بی سے زیادہ نکاح میں نہ لاسکے۔ پس قرآن کریم نے صاف طور پر سمجھا دیا کہ نکاح میں قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی اور ایک شوہر ہو۔ ہاں جب ضروریات پیدا ہو جائیں تو پھر تعدد ازدواج کی طرف بطور ایک استثنا کے رجوع کرنا پڑتا ہے

دوسرا نتیجہ جو ان الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تعدد ازدواج پر عدل کی ایک بڑی بھاری روک ہے اور دوسری جگہ فرمایا۔ "ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم"۔ تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو۔ خواہ تم کتنا ہی چاہو۔ ان الفاظ سے

بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے کہ یہاں عدل کی شرط رکھ کر اور دوسری جگہ عدل کو انسانی استطاعت سے باہر قرار دیکر تعلیق بالمحال کردی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی منشار تھا تو صاف یوں ہی فرما دیا ہوتا کہ تعدد ازدواج کی تمہیں اجازت ہی نہیں۔ یہ محض یوروپ کی تقلید نے باتیں کہلوائی ہیں مگر مقلدین یوروپ خوب یاد رکھیں کہ یوروپ ایک سیہ کاری اور گند کے اندر مبتلا ہے جس سے اگر کبھی وہ باہر نکل سکتا ہے تو خدا کے بتائے ہوئے علاج تعدد ازدواج کے ذریعہ ہی سے نکل سکتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ جہاں عدل کے ساتھ تعدد ازدواج کو مشروط کیا ہے تو وہاں مراد ظاہری سلوک میں عدل ہے یعنی نان و نفقہ میں باری میں اور ظاہری امور میں۔ اور جہاں یہ فرمایا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے وہاں محبت میں مساوات مراد ہے یعنی دو بیویوں سے یکساں محبت یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اور اس پر خود قرینہ شاہد ہے کیونکہ وہاں آگے فرمایا۔ "فلا تمیلوا کل المیل"۔ یعنی محبت کے معاملہ میں بالکل ایک طرف نہ جھک جاؤ۔ یہاں تک کہ ایک غریب عورت بیوی کہلا کر پھر درمیان میں لٹکی ہوئی ہو۔ پس عدل کی اس تشریح کے سمجھانے کو ہی وہ لفظ اختیار فرمائے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں پھر سمجھا دیا کہ تعدد ازدواج ایک بڑا مشکل مقام ہے جس کو بغیر سخت ضرورت کے اختیار نہ کیا جائے۔"

اس توجیہ و تشریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے خاص حالات

کے تحت اور خاص شرائط کے ساتھ تعداد ازدواج کی اجازت دی تھی۔ چونکہ وہ حالات ایسے تھے جو ہر زمانہ میں پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کے علاوہ ہر قوم میں ایسے افراد کی ایک خاص تعداد موجود رہتی ہے جن کو کسی نہ کسی وجہ سے دوسری شادی کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے اگر تعدد ازدواج کو بالکل روک دیا جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ لوگ فواحش، بدکاری اور جنسی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر سوسائٹی کو ان خرابیوں سے پاک رکھنا ہے اور انفرادی طبائع اور شخصی حالات کی رعایت رکھنی مقصود ہے تو تعدد ازدواج کو قانوناً منع نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ چونکہ قرآن نے چند مخصوص ضروریات و حالات کے تحت ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی تھی اس لئے اسٹیٹ کو یہ حق ضرور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ تعدد ازدواج کی اجازت پر مناسب پابندیاں اور شرائط لگائے مثلاً قانون میں ایک دفعہ یہ رکھی جا سکتی ہے کہ ہر مرد کو تعدد ازدواج کی اجازت اس شرط سے دی جائے گی کہ وہ عدالت میں حاضر ہو کر اپنی ضرورت پیش کرے کہ دوسرے نکاح سے اس کی پہلی بیوی کے حقوق متاثر نہ ہوں گے۔ بہ الفاظ دیگر اسے یہ ثابت کرنا پڑیگا کہ معاشی حالات کے لحاظ سے وہ اتنا فارغ البال ہے کہ دو بیویوں اور اُن کی اولاد کی کفالت کر سکتا ہے۔ جن ضروریات کو واجبی تسلیم کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:-

(الف) پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی ہو اس کے لئے ایک خاص مدت مقرر کی جا سکتی ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ

شادی کے دو تین سال بعد تک اولاد نہ ہو لیکن چوتھے
پانچویں سال اولاد ہو

(ب) بیوی دائم المریض ہو یا کسی ایسے مرض میں مبتلا
ہو کہ اس کے ساتھ جماع ناممکن ہو جائے۔

(ج) اگر بیوی جلد بوڑھی ہو جائے اور شوہر
جوان رہے۔

ان حالات میں دوسری تیسری اور چوتھی شادی کی
اجازت دی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس سے مرد پر معاشی ذمہ داریوں
کا بوجھ اتنا زیادہ نہ ہو کہ اسے برداشت نہ کر سکے۔

اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی

گذشتہ تیرہ سو سال میں مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصولوں سے اتنا شدید انحراف کیا ہے کہ اب اُن کی سوسائٹی میں اسلام کے بہت کم اجزار باقی رہ گئے ہیں۔ روایت پرستی اور جامد تقلید کے باعث ہر آنے والے دور نے سابقہ ادوار کی تقلید کو کافی سمجھا اور اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ اسلام ایک دائمی مذہب اور عالمگیر ضابطۂ حیات کی حیثیت سے ایسی غیر تبدیل پذیر اور بے لچک تعلیمات پر مبنی نہیں ہو سکتا جو زندگی کے متغیر حالات وکیفیات کا ساتھ نہ دے سکیں۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانی معاشرہ بہ لحاظ حالات تغیر پذیر اور ارتقائی ہے۔ جو معاشرہ کسی ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے اور نئے حالات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں پیدا کر سکتا وہ بہت جلد کمزور اور فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشرہ کی اصل واساس ثابت وقائم ہونی چاہیئے اور وہ اصول حیات جن پر اس کی تنظیم وتعمیر عمل میں آتی ہے اپنی جگہ غیر متغیر ہیں لیکن فروع وتفصیلات میں بلحاظ مقتضیات تبدیلی ضروری ہے اور اصولوں کا اطلاق حالات کی تبدیلی کے تابع ہے۔ اسی لئے ہر زندہ معاشرہ بنیادی اصول وافکار کے اعتبار سے غیر متغیر ہونے کے باوجود اپنی شکل وصورت اور نقش ونگار کو باعتبار تفصیلات وجزدیات بدلتا رہتا ہے جس معاشرہ میں ارتقاء وتبدیلی کی یہ صلاحیت نہو اور جو اپنے تفصیلات وجزدیات اور نقش ونگار کو بھی تغیرات کے تھپیڑوں سے محفوظ

رکھنا چاہے وہ اپنے زوال اور انحطاط کا سامان خود ہی پیدا کر لیتا ہے
عورتوں کے حقوق اور ان کے مرتبہ کے بارے میں بھی مسلمانوں نے وہی جامد
تقلیدی اور غیر ارتقائی روش اختیار کی جو انھوں نے اور مسائل میں برتی تھی۔ بلکہ
اس معاملہ میں مسلمانوں کی روش ارتجاعی تھی۔ یعنی انھوں نے نہ صرف عورتوں کو
اس مقام سے آگے نہیں بڑھایا جس میں اسلام نے انھیں حالات و مصالح کی
مجبوری سے چھوڑا تھا بلکہ کچھ اور پیچھے ڈھکیل دیا۔ نیز رفتہ رفتہ مسلمان مردوں نے
ان کے اکثر حقوق غصب کر لئے۔ . . . .
اور انھیں زیور علم سے آراستہ کرنے کے بجائے ایک جانی بوجھی اسکیم کے تحت
جہالت اور بے علمی میں مبتلا کر دیا۔ عورتوں کے بارے میں اسلامی احکام کی
مسلمانوں نے جو تعبیریں کیں وہ انتہائی تنگ نظری پر مبنی تھیں۔ علاوہ ازیں
انھوں نے ان احکام کو بالکل بے لچک اور غیر تبدیلی پذیر سمجھ لیا، حالانکہ
اسلام نے اُن میں ایک لچک رکھی تھی تاکہ تبدیلی حالات کے لحاظ سے ان میں
مناسب ترمیمات عمل میں لائی جا سکیں۔
اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ مسلمانوں نے عورتوں کے حقوق
کس طرح پامال کئے اور اسلامی احکام کی کتنی تنگ نظری سے تعبیر کی ہے۔ پہلے
بتانا پڑیگا کہ اسلام کی آمد سے قبل عورتوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے
اس حالت میں کیا اصلاح و تبدیلی کی۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ اسلام نے
عورتوں کی آمد و رفت، وضع قطع اور رفتار و گفتار پر جو پابندیاں لگائی تھیں
ان کے وجوہ و علل کیا تھے اور کیا وہ علتیں اب بھی باقی ہیں جو ان
پابندیوں کی موجب تھیں۔
عہد جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا وہ

اسلام اور عصر جدید

کسی طرح غلاموں کے ساتھ عربوں کے سلوک سے مختلف نہ تھا۔ عرب لوگ اپنی عورتوں کو جائداد منقولہ کی طرح ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔ چنانچہ عورتیں نسلاً بعد نسلاً باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے پر وراثت منتقل ہوتی ہوتیں اسلام نے آکر انھیں مساوات کا درجہ دیا اور عربوں کو بتایا کہ عورتیں بھی انسانیت کے وہی بنیادی حقوق رکھتی ہیں جو مرد نیز ان کی ایک جداگانہ انفرادیت اور ذاتی شخصیت ہے جو ان کے حقوق کے تعین پر مؤثر ہوتی ہے اور جس کا احترام بہر صورت ضروری ہے۔ ان باتوں کے باوجود اسلام نے ایک پہلو سے جاہلیت کی نسوانی آزادیوں کو محدود بھی کیا کیونکہ یہ آزادی اخلاقی قیود سے مبرا ہونے کے باعث بے راہ روی کی طرف لے جارہی تھی۔ اسلام سے قبل عربوں کی عورتیں اپنی زبوں حالی اور محرومی حقوق کے باوجود بڑی بے حجابی اور بے باکی سے باہر آیا جایا کرتی تھیں۔ اور مردوں سے میل جول میں کوئی احتیاط نہیں برتتی تھیں۔ ان کا جنسی اخلاق بیحد خراب تھا اور عربوں کے معاشرہ میں ناجائز تعلقات کی اتنی کثرت تھی کہ خاندانی نظم درہم برہم ہو رہا تھا۔ عام طور پر عربوں میں صنف نازک کو صرف جنسی لذت اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ عرب لوگ اپنی عورتوں کو افزائش نسل کا ایک آلہ سمجھتے تھے۔ ازدواجی رشتہ میں کوئی پائداری نہ تھی اور خاندانی نظام کی بنیادیں متزلزل تھیں۔ عورتوں کا لباس اور ان کا انداز گفتار و رفتار کچھ اس قسم کا تھا کہ مردوں کی نفسانی خواہشات کو خواہ مخواہ تحریک ہوتی تھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے عربوں کے جنسی اخلاق کا معیار بہت گر گیا تھا۔ قرآن نے اسی صورت حال

کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ احکام دئے تھے:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ وآتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ	اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جاہلیت کے بناؤ سنگار کو ترک کردو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔
یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین	اے نبی اپنی بیویوں سے اور اپنی لڑکیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہو کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیں یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور ان سے خواہ مخواہ چھیڑ کی جائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں جب عورتیں گھروں سے باہر نکلتی تھیں تو بہت بن سنور کر اور بڑی زینت و آرایش اور آب و تاب کے ساتھ تاکہ مردوں کے لئے جاذب نظر اور باعث کشش بن سکیں۔ اسی طرح قرآن کا یہ حکم کہ غیروں کے گھروں میں داخل ہونے سے قبل صاحب خانہ کی اجازت لے لیا کرو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عربوں کو مدنی اور معاشرتی زندگی کے ابتدائی اصولوں اور تہذیب و شائستگی کے معمولی قواعد سے بھی واقفیت نہ تھی۔ نکاح و ازدواج کا رشتہ عربوں میں کتنا کمزور تھا اور عربوں کے جنسی اخلاق کتنے گر گئے تھے اس کا حال ہمیں حسب ذیل روایت

سے معلوم ہوتا ہے جس کی راوی حضرت عائشہ زوجہ رسول ہیں:

ان النکاح فی الجاهلیه کان
علیٰ اربعة انحاء فنکاح منها
نکاح الناس الیوم یخطب
الرجل الی الرجل ولیته
او ابنة فیصدقها ثم ینکحها
ونکاح آخر کان الرجل
یقول لامرأته اذا طهرت
من طمثها ارسلی الی فلان فاستبضعی
منه ویعتزلها زوجها ولا یمسها حتی
یتبین حملها من ذالك الرجل ناذا
یتبین حملها صاحبها
زوجها اذا احب وانما
یفعل ذالك رغبة فی
نجابة الولد وکان هذا
النکاح نکاح الاستبضاع
ونکاح آخر یجتمع الرهط
ما دون العشرة علی
المراة کلهم یصیبها
فاذا حملت ووضعت
ومر لیال بعد ان تضع

جاہلیت میں نکاح چار طریقوں
سے ہوتا تھا۔ ایک نکاح تو
اسی طرح کا تھا جس طرح
آج کل لوگ نکاح کرتے ہیں
کہ ایک شخص دوسرے کی لڑکی
یا ولیہ سے نکاح کا پیام دیتا
تھا۔ پھر اس کو مہر ادا کرکے نکاح
کرلیتا تھا۔ دوسرا طریقہ نکاح کا
یہ تھا کہ جب عورت اپنی ناپاکی
کی حالت سے نکل آتی تھی تو مرد
اس سے کہتا تھا کہ فلاں شخص
کے پاس جا اور اس سے مباشرت
کر پھر کچھ عرصہ کے لئے وہ اپنی
بیوی سے الگ رہتا اور اس
کو ہاتھ تک نہ لگاتا یہاں تک
کہ وہ دوسرے شخص سے حاملہ
ہوجاتی۔ پھر جب اس کا حمل
ظاہر ہوجاتا تو مرد جب چاہتا
اس سے مباشرت کرتا اور وہ
یہ طریقہ اس لئے اختیار کرتا تھا

حملها ارسلت اليهم فلم
يستطع رجلٌ منهم ان
يمتنع حتى يجتمعو عندها
فتقول لهم قد عرفتم
الذي كان من امركم وقد
ولدت فهو ابنك يا فلان
تسمى من احبت فتلحق به
ولدها ولا يستطيع ان
يمتنع الرجل ونكاح رابع
يجتمع الناس الكثير
فيدخلون على المرأة
لا تمتنع ممن جاءها
وهن البغايا كن ينصبن
على ابوابهن الرايات
وتكون علمًا فمن ارادهن
دخل عليهن فاذا حملت
احداهن ووضعت حملها
جمعوا لها ودعوا لها
القافة ثم الحقوا ولدها
بالذين يرون فالتاط
به ودعي ابنه لا يمتنع

تاکہ اس کا لڑکا نجیب کہلائے
اور یہ نکاح نکاح استبضاع
کہلاتا تھا اور دوسرا نکاح یہ
تھا کہ دس سے کم کی تعداد میں
کچھ لوگ ایک عورت کے پاس
جمع ہو جاتے اور پھر ہر ایک
شخص ان میں سے فعل مباشرت
کرتا۔ پھر جب اس کے حمل ٹھہر جاتا
اور بچہ پیدا ہو جاتا اور وضع
حمل کے بعد کچھ عرصہ گذر جاتا
تو وہ عورت انھیں بلا بھیجتی
تو ان میں سے کوئی مرد آنے سے
انکار نہیں کر سکتا تھا۔ یہانتک
کہ جب وہ سب جمع ہو جاتے تو
عورت ان سے کہتی تم جانتے ہو جو
کچھ ہو چکا ہے یہ تمہارا فعل ہے
میں نے جو بچہ جنا ہے وہ اسے
فلاں شخص تمہارا بچہ ہے وہ
جس مرد کا نام چاہتی لے لیتی
اور اس کو اس کا بچہ سپرد کر دیا
جاتا۔ چوتھا طریقہ نکاح کا

من ذالك فلما بعث محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالحق هدم نکاح الجاهلیة الا نکاح الاسلام الیوم

یہ تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہوتے پھر کسی ایک عورت کے مکان میں داخل ہوتے اور وہ عورت کسی مرد سے انکار نہ کرتی ۔ یہ بسوائیں تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈے گاڑتی تھیں اور یہ علامت تھی ۔ پھر جو چاہتا ان سے مباشرت کرتا ۔ پھر جب اس کے حمل ٹھہر جاتا اور بچہ پیدا ہوتا تو وہ اس کے پاس جمع ہوجاتے تھے اور قیافہ سے معلوم کر لیتے تھے کہ بچہ کس کا ہے ۔ پھر وہ جس کو مناسب سمجھتے بچہ حوالے کر دیتے پھر وہ بچہ اس سے متعلق ہوجاتا اور اس کا بیٹا کہلاتا اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا ۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جاہلیت کا یہ طریقہ مسدود ہوگیا۔

حضرت عائشہ کی اس روایت سے عربوں کے جنسی اخلاق اور صنفی زندگی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ ان حالات میں

اسلام نے یہ ضروری سمجھا کہ عورتوں کو بے حیائی اور بیحیائی سے روکا جائے اور انھیں تہذیب و شائستگی کی کچھ باتیں بتائی جائیں ۔ نیز یہی حالات تھے جن میں اسلام نے عورتوں کی بے قید آزادی کو محدود کرنے کے لئے اُن کے لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار کے طریقوں پر کچھ پابندیاں عائد کیں تاکہ اس طرح ناجائز جنسی تعلقات اور فواحش کی کثرت میں تخفیف کی جاسکے ۔ اور خاندانی نظام کو پائدار بنیادوں پر اُستوار کیا جاسکے ۔ یہ پابندیاں اس وقت کے حالات میں ضروری تھیں لیکن ان کا یہ مطلب نہ تھا کہ انسانی معاشرہ ارتقاء کے کسی مرحلہ پر پہونچ جائے اور حالات کتنے ہی بدل جائیں پھر بھی یہ سب پابندیاں بلا حذف و ترمیم من وعن اسی طرح قائم رہیں گی ۔ اس کے برخلاف ان تمام جزوی تعلیمات کو عمداً لچکدار رکھا گیا تھا تاکہ معاشرہ اپنی مختلف ارتقائی منازل میں بلحاظ حالاتِ وقت اور مقتضیاتِ عہد ان میں ترمیم و تبدیلی کرتا جائے مثلاً جنسی اخلاق کے معیارات گرنے لگیں تو یہ پابندیاں اور سخت کی جاسکتی ہیں ۔ اسی طرح اگر عام معیار اخلاق کسی زمانہ میں بلند ہو جائے تو ان قیود اور پابندیوں میں نرمی پیدا کی جاسکتی ہے ۔ ہمارے اس استدلال کا ثبوت خود خلفائے راشدین کے طرزِ عمل میں ملتا ہے جن کے زمانہ میں حالات کچھ مختلف ہو گئے تھے ۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں محسوس کیا کہ دولت کی فراوانی کے باعث مسلمانوں کے جنسی اخلاق کا معیار کسی قدر گر گیا ہے ۔ اس صورت حال کا سد باب کرنے کے لئے آپ نے عورتوں کا مسجدوں میں آکر نماز میں شریک ہونا ناپسند کیا ۔ حالانکہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں عورتیں مساجد میں بڑی آزادی سے شرکت نماز کے لئے آتی

جاتی تھیں۔ اگرچہ حضرت عمر نے عورتوں کی مساجد میں آمد و رفت کو بالکل ممنوع نہیں کیا، لیکن بڑی حد تک اس رواج کو گھٹا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی باہر آمد و رفت اور لباس وغیرہ کے بارے میں اسلام نے جو احکام دیے تھے وہ لچکدار تھے اور بلحاظ حالات ان میں شدت یا تخفیف کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح حضرت عمر نے طلاق کے بارے میں بھی ایک نیا قاعدہ رواج دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررہ طریقہ سے مختلف تھا۔ حضور کے زمانہ میں کوئی طلاق طلاق بائن نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ ایک ایک ماہ کے فصل سے تین طلاقیں نہ دی جائیں۔ حضرت عمر نے محسوس کیا کہ لوگ طلاق دینے میں بڑی بے احتیاطی برتتے ہیں اور بیک وقت تین طلاقیں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے حالانکہ یہ طریقہ شرعاً ممنوع ہے۔ اس لئے آپ نے سزاً یہ حکم دیا کہ آئندہ سے بیک وقت تین طلاقوں کا بھی وہی قانونی اثر ہوگا جو ایک ایک ماہ کے فصل سے تین طلاقوں کا ہوتا ہے یعنی ایسی طلاقیں بھی طلاق بائن کا حکم رکھیں گی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگ طلاق کو کھیل نہ سمجھیں بلکہ طلاق دینے میں بڑی احتیاط برتیں۔ یہ طریقہ آنحضرت کے طریقہ سے بالکل مختلف تھا اور اس سے پھر یہی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح و طلاق اور عورتوں کی آمد و رفت اور لباس کے جو احکام اسلام نے نافذ کئے تھے ان میں بلحاظ حالات و مقتضیات ترمیم و تبدیلی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ یہ قواعد اتنے سخت اور بے لچک نہیں ہیں کہ زمانہ کے تقاضوں اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ان کو مطابقت نہ دی جا سکے یہی حقیقت ہے جسے اب مسلمان بھول گئے ہیں۔

عراق، شام اور مغربی ایشیا کے دیگر علاقوں کی فتوحات کے بعد

عربوں کے معاشی نظام اور معاشرتی زندگی میں بڑی زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ابتدائے اسلام میں ہر مسلمان مرد اور عورت کو معاشی اخلاقی اور دینی تقاضے کے لئے مصروف جہاد رہنا پڑتا تھا۔ کسی شخص کو آرام و راحت اور فرصت کی زندگی گزارنے کا موقعہ نہیں تھا۔ اس لئے معاشرتی، مذہبی اور معاشی حاجات کے لئے عورتوں کی باہر آمد و رفت ضروری تھی۔ اور اس آمد و رفت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان عورتوں کو ضرورتاً مردوں سے بات چیت بھی کرنی پڑتی اور بعض وقت اُن کے ساتھ مل کر کام بھی کرنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ تک عورتیں نسبتاً آزاد تھیں اور ان پر وہ معاشرتی قیود عائد نہیں کئے جا سکتے تھے جو بعد میں چل کر پردہ کی شکل میں ظاہر ہوئے اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں بالآخر تمدنی اور معاشرتی زندگی سے بالکل الگ تھلگ ہو کر گھریلو کاموں کے لئے وقف ہوگئیں۔ آنحضرت کے زمانہ میں عورتیں بلا تکلف گھر سے نکل کر آپ کے پاس آتی تھیں اور آپ سے مذہبی، اور معاشرتی مسائل پر آزادانہ گفتگو کرتی تھیں۔ حضرت ام عطیہ نسیبہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عید الضحیٰ اور عید الفطر کے مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید عورتوں کو حکم دیا کہ وہ عید گاہ آئیں اور نماز میں شرکت کریں۔ اسلام نے عورتوں کی زیب و زینت اور گفتار و رفتار پر جو پابندیاں لگائیں وہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اس زمانہ میں عورتیں گھروں سے باہر نکل کر مختلف کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ ورنہ اگر آج کل کے مسلمانوں کی طرح اس زمانہ میں بھی عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند ہوتیں تو ان پابندیوں کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن عربوں کی فتوحات کا دائرہ جیسا جیسا وسیع ہوتا گیا مسلمان کے ایک بہت بڑے طبقہ کو آرام اور فرصت کی زندگی کا موقعہ ہاتھ آیا جس میں کسی

قسم کی معاشی جدو جہد کی ضرورت نہ تھی ۔ پھر مفتوحہ علاقوں کی آراضی کو تقسیم کردینے سے مسلمان عربوں میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا جسے گھر بیٹھے کھانے کو ملتا تھا اور جسے قطعاً عورتوں کے معاشی تعاون کی حاجت نہ تھی ۔ یہ لوگ فرصت اور عیش و تنعم کی زندگی گزارتے تھے اس لئے انھیں عورتوں کا باہر آنا جانا یا معاشی اور مذہبی کاموں میں حصہ لینا سخت ناپسند تھا ۔ عورتوں کے حقوق اور انکی جائز آزادیوں پر اس صورت حال کا بہت برا اثر پڑا ۔ پھر جاگیرداری نظام کا ظہور ہوا اور مسلمان عربوں کا مفتوحہ علاقوں کی اقوام سے میل جول بڑھا ۔ ان دونوں عوامل نے مل جل کر جنسی اخلاق کے عام معیار کو گرادیا ۔ اس لئے مسلمانوں نے بہ نظر احتیاط عورتوں کی آزادی کو اور زیادہ محدود کردیا اور ان کی پابندیوں میں اضافہ کردیا ۔ کچھ زمانہ کے بعد مسلمان بادشاہوں اور امرا نے بازنطینی فرمانرواؤں کی دیکھا دیکھی حرم کے طریقہ کو رواج دینا شروع کیا ۔ چونکہ بادشاہوں کے حرم میں بیویوں اور باندیوں کی غیر محدود تعداد داخل کی جاتی تھی اور اتنی بہت سی عورتوں کی جنسی پیاس کا بجھانا ایک امر دشوار تھا اس لئے لازمی طور پر بادشاہوں اور امرا کو اپنے حرم کی عورتوں کے چال چلن کی طرف سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا ۔ اس خطرہ کو رفع کرنے کے لئے انھوں نے عورتوں کو اپنے قصور اور محلات کی چار دیواری میں بالکل محصور کردیا اور ان کی آزادی یکسر سلب کرلی ۔ پھر بادشاہوں اور امرا کے اس رواج سے اعلیٰ طبقات اور متوسط طبقے بھی متاثر ہوئے اور ان کے یہاں بھی رفتہ رفتہ عورتوں کا وہی حال ہوگیا جو حرم سرائی عورتوں کا تھا ۔ اکبر نے اسی منظر کی کھینچتے ہوئے کہا :۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی ٭ تو کام دینگی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

غرضکہ پردہ کا موجودہ رواج عورتوں کی خانہ نشینی اور معاشرتی، سیاسی

اور تمدنی معاملات سے اُن کی بے تعلقی یہ تمام خصوصیات بادشاہوں اور امراء کے طرزِ زندگی کی پیدا کردہ ہیں اور اُن کی پشت پر کوئی مذہبی سند یا حکم نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ مسلمانوں کے غریب اور نادار طبقہ کی عورتوں میں نہ تو پردہ کا اتنا سخت رواج ہے اور نہ معاشی زندگی کی جدّوجہد سے مسلمانوں کی غریب عورتیں بالکل الگ رہ سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں امراء اور متوسط طبقات کے طرزِ زندگی کی نقالی کے باعث پردہ کا رواج کسی نہ کسی درجہ میں غرباء کے طبقہ میں بھی پیدا ہوگیا۔ لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں۔ مگر دیہی علاقوں میں آج تک مسلمان عورتیں اُسی آزادی سے باہر آتی جاتی اور معاشی کاروبار میں حصہ لیتی ہیں جس طرح ابتدائے اسلام میں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ امراء اور خوشحال افراد نیز متوسط طبقات کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ عورتوں کی معاشی زندگی میں شرکت کے بغیر بھی وہ آسودگی اور اطمینان کی زندگی گزار سکیں لیکن غریب طبقوں اور بالخصوص دیہی آبادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورتیں بھی تجارتی اور زراعتی کاروبار میں حصّہ لیں۔ اس لئے ان طبقوں اور علاقوں کی مسلمان عورتیں نہ تو پردہ کی پابند ہیں اور نہ معاشی کاروبار سے الگ تھلگ ہو سکتی ہیں۔ خود پاکستان کے قبائلی علاقہ میں جہاں کے لوگ بڑی سختی سے مذہب کے پابند اور احکام شریعت پر عامل ہیں۔ عورتیں اسی آزادی سے باہر آتی جاتی اور کاروبارِ دنیوی میں حصّہ لیتی ہیں جس طرح مرد اور ان علاقوں میں عورتوں کی اس آزادی کو نہ تو خلاف شرع تصور کیا جاتا ہے اور نہ ان کے جنسی اخلاق پر اس کا کوئی خراب اثر مترتب ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں متوسط طبقات میں عورتوں کو جن قیود اور پابندیوں میں زندگی گذارنی پڑتی ہے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ طریق

زندگی مذہبی تعلیمات پر مبنی ہے کیونکہ مذہبی تعلیمات سب طبقوں کے لئے یکساں ہیں خواہ امیر ہوں یا غریب ۔ واقعہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات اور معاشرتی زندگی میں اُن کے باہمی حقوق کا تعین بڑی حد تک معاشی ضروریات و حالات کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں ۔ چونکہ دنیا کے معاشی نظامات تبدیل پذیر ہیں اور معاشی ارتقاء کے ساتھ انسان کی معاشی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں اس لئے اسلام نے عورتوں اور مردوں کے حقوق اور مرتبہ کا کوئی آخری اور دائمی تصفیہ نہیں کیا جو آنے والی تبدیلیوں کا ساتھ نہ دے سکے ۔ عورتوں اور مردوں کے جنسی اخلاق کے تحفظ کی غرض سے اس نے جو قیود اور بندشیں تجویز کیں وہ ترمیم پذیر اور لچکدار رکھیں تاکہ معاشرہ کی مختلف حالتوں اور تقاضوں میں ان قیود اور پابندیوں کو نرم یا سخت بنایا جاسکے ۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ خود ابتدائے اسلام میں جنگی ضروریات کے تحت ان قیود اور بندشوں کو بعض صورتوں میں معطل اور بعض صورتوں میں نرم کردیا گیا ۔ مثلاً جنگ احد کے زمانہ میں عورتوں کو اجازت دی گئی کہ وہ آزادی کے ساتھ مردوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیں چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے :۔

عن انس قال لما کان یوم احد انہزم الناس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ولقد رأیت عائشہ بنت ابی بکر وام سلیم وانہما لمشمرتان اری خدم سوقہما	حضرت انس کا بیان ہے کہ جنگ احد میں حضور کو لوگ چھوڑ کر بھاگ نکلے ۔ میں نے حضرت عائشہ اور ام سلیم کو دیکھا کہ اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھا کر پانی کی مشکیں اپنی کمر پر لاد کر زخمیوں کو

تنصران القرب علی متونهما ثم تفرغانه فی افواه القوم

پانی پلا رہی تھیں۔

اسی طرح جب ذیل روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں پر جو تھوڑی بہت پابندی اسلام نے ضروریات و مصالح کے تحت عائد کی تھیں وہ زمانہ جنگ میں منسوخ کر دی جاتی تھیں۔

عن حفصه قالت کنا نمنع عواتقنا ان یخرجن فی العیدین فقدمت امراة فنزلت قصر بنی خلف فحدثت عن اختها وکان زوج اختها غزا مع النبی صلی الله علیه وسلم ثنتی عشرة غزوة وکانت اختی معه فی ست قالت فکنا نداوی الکلمی و نقوم علی المرضی

(بخاری کتاب العیدین)

حضرت حفصہ کا بیان ہے کہ ہم اپنی جوان لڑکیوں کو عیدگاہ میں جانے سے روکتے تھے ایک مرتبہ ایک خاتون قصر بنی خلف میں آکر اتریں اور اُنھوں نے اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی کے متعلق بیان کیا کہ میرے بہنوئی نے حضور کی معیت میں بارہ غزووں میں شرکت کی اور ہمشیرہ نے چھ جنگوں میں حصہ لیا۔ میری ہمشیرہ کا بیان ہے کہ ہم عورتیں جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور اُن کی دیکھ بھال کرتی تھیں

عن ام عطیه قالت غزوت مع النبی صلی الله علیه وسلم سبع غزوات اخلفهم فی

حضرت ام عطیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور کے ساتھ سات غزوات میں حصہ لیا میرا یہ کام تھا

کہ مجاہدین کا کھانا پکاتی زخمیوں
کی مرہم پٹی کرتی اور مریضوں
کی دوا دارو کرتی

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر زمانہ اسلام میں عورتیں جنگی ضروریات کے پیش نظر مردوں کا دوا علاج اور مرہم پٹی وغیرہ کرتی تھیں تو زمانہ صلح میں جو پابندیاں مردوں سے میل جول اور بات چیت کے بارے میں ان پر عائد کی گئی تھیں انھیں زمانہ جنگ میں بالکل معطل کر دیا گیا ہوگا ورنہ عورتوں کا جنگی خدمات میں حصہ لینا ناممکن تھا۔ اس سے پھر یہی ثابت ہوا کہ عورتوں پر زمانہ جاہلیت کے اطوار و عادات کے مدنظر اسلام نے چند بندشیں عائد کی تھیں وہ دائمی نوعیت کی نہ تھیں بلکہ ضروریات وقت اور مصالح زمانہ کی تابع تھیں۔ اب اگر کسی زمانہ کی ضروریات اور مصالح کا اقتضا یہ ہو کہ ان پابندیوں میں تخفیف کر دی جائے یا ان میں سے بعض پابندیاں بالکل اُٹھالی جائیں تو یہ عمل نہ تو خلاف شریعت ہوگا اور نہ خدا اور رسول کی نافرمانی کے مترادف ہو سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کی ترمیمات اور تبدیلیوں کو عمل میں لانے کے لئے افراد کے ذاتی مصالح یا کسی خاص طبقہ کی ضروریات کو پیش نظر صحیح نہ ہوگا صرف اُمت کی اجتماعی ضروریات اور مصالحت کے تحت ہی ایسا عمل جائز ہو سکتا ہے

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ اگر اسلام کو ساتویں صدی عیسوی کا نہیں بلکہ بیسویں صدی عیسوی کا زمانہ ملتا تو وہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے موجودہ زمانہ کے حالات اور عہد اسلام کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ مثلاً آج کل کی جنگ کو لیجئے اور اُس

کا مقابلہ ان جنگوں سے کیجئے جو مسلمانوں کو ابتدائے اسلام میں کافروں کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔ آج کل جنگ کی تیاری کے لئے دس سال کی مدت بھی ناکافی ہے۔ زمانہ اسلام میں ایک ہفتہ کی نوٹس پر بھی جنگ کی جا سکتی تھی۔ آج کل کے زمانہ میں کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے پسماندہ ہو اور جس میں چند بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا ملک کی بیشتر آبادی پر قبضہ ہو کامیابی کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کی جنگ کے لئے وسیع پیمانہ پر آلات حرب کی تیاری اور خوراک کی بہم رسانی ضروری ہے۔ پھر جس ملک میں بڑے بڑے کارخانے نہ ہوں جہاں آلات جراحی کی صنعت کا وجود نہ ہو۔ جہاں اعلیٰ درجہ کے ہسپتال اور عمدہ تربیت یافتہ نرسیں نہ ہوں۔ جہاں کی سول آبادی مدافعتی جنگ کے طریقوں سے ناواقف ہو جہاں کا کاشتکار طبقہ زمین میں حقوق نہ رکھنے کی وجہ سے اراضی کی کاشت اور غلہ کی پیداوار سے کافی دلچسپی نہ رکھتا ہو وہ ملک کس طرح میدان جنگ میں طاقتور حریفوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور یہ سب انتظامات ایسے نہیں کہ دو ایک ماہ یا دو ایک سال کی کوشش سے مکمل ہو جائیں۔ ان کے لئے دس پندرہ بلکہ بیس پچیس سال کی لگاتار کوششیں درکار ہیں پھر اگر کوئی قوم اپنی مدافعت اور تحفظ کے اغراض کے لئے صنعتی توسیع، دفاعی تربیت اور طبی امداد کے انتظامات وغیرہ شروع کرے تو کیا اس ملک کی عورتوں کو ان کاموں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کی تعداد ملک کی نصف آبادی کے برابر بلکہ بعض وقت زیادہ ہوتی ہے۔ جس ملک کی نصف سے زائد آبادی جنگی اور دفاعی تیاریوں میں مردوں کا ہاتھ نہ بٹا سکے اور دیہاتی لت

کم علمی اور پردہ کی قید و بند کے باعث ذاتی تحفظ کے طریقوں سے ناواقف ہو اس کی کامیابی اور بقاء و ترقی کا کیا امکان ہے ۔ اب ہمارے ملک کی عورتوں کا حال یہ ہے کہ وہ باہر نکل کر مردوں سے بات چیت کرتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں نیز معاشی کاروبار، حکومتی انتظامات اور معاشرتی خدمات کی اہلیت سے محروم ہیں ایسی صورت میں یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ ہم کسی وقت حالت جنگ میں مبتلا ہو جائیں تو ہماری عورتیں اس خلا کو پورا کر سکیں گی جو کثیر تعداد میں مردوں کے لڑائی پر جانے سے پیدا ہو جائیگا۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہمیں عورتوں کو اس سے زیادہ آزادی دینی پڑیگی جتنی انھیں زمانہ اسلام میں حاصل تھی کیونکہ اسلامی عہد میں جنگ کی نوعیت اتنی پیچیدہ نہ تھی اور نہ ملک کے معاشی اور صنعتی نظام میں عورتوں کے تعاون کی حاجت اس پیمانہ پر تھی ۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو اتنی بھی آزادی حاصل نہیں، جتنی مسلمان عورتوں کو عہد رسالت یا خلافت راشدہ کے دور میں حاصل تھی بلکہ ہم نے اپنی عورتوں کو اس سے بھی پیچھے دھکیل دیا ہے۔ زمانہ اسلام میں نہ اس قسم کا رواجی پردہ تھا نہ عورتیں معاشی کاروبار، مذہبی امور اور سیاسی معاملات سے اتنی بے تعلق تھیں وہ نسبتاً آزادی سے باہر آتی جاتی تھیں اور ضرورت کے وقت مردوں کے ساتھ مذہبی، جنگی اور سیاسی کاموں میں تعاون بھی کرتی تھیں جنگ جمل میں حضرت عائشہ نے بنفس نفیس حضرت علی کے خلاف فوج کی قیادت کی ۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کے تعاون کی حاجت اس سے کہیں زیادہ اور وسیع تر پیمانہ پر ہے حالانکہ ہماری عورتیں بالکل پا بہ زنجیر اور مقید ہیں ۔ پھر اس امر سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے حالات اور

مصالح کا اقتضا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں پر جو پابندیاں لگائی تھیں اور جنھیں ہم نے گزشتہ صدیوں میں اور زیادہ سخت اور ہمہ گیر کر دیا ہے، ان میں تخفیف کر دی جائے اور عورتوں کو صنعتی امور، طبی خدمات، دفاعی تیاریوں اور جنگی تربیت کے لئے آزاد کر دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مردوں اور عورتوں کا بلاضرورت اختلاط اسلام کی نظروں میں ناپسندیدہ ہے کہ لیکن ضرورت اور مجبوری کے تحت عورتیں مردوں کے ساتھ کام کر سکتی ہیں۔ احتیاط ضرور رکھنی پڑے گی کہ جہاں اجتماعی ضروریات کا کوئی شدید تقاضہ نہ ہو۔ وہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان خلا ملا نہ ہونے پائے۔ اسی طرح اسلام نے عورتوں کے لباس، اور زینت پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ انھیں بھی حتی الامکان برقرار رکھنا ضروری ہے، ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ہوگا وہ بدلے حالات میں جب کہ عورتوں کو آزادی دینا ضروری ہے۔ اس بات کی تمام ضروری تدابیر اختیار کرے کہ مردوں عورتوں کے جنسی اخلاق کا معیار نہ گرنے پائے، ایسی احتیاطی تدابیر اگر عمل میں لائی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اجتماعی اور تمدنی ضروریات کے تحت مردوں اور عورتوں کا باہمی تعاون خراب نتائج پیدا کرے۔ اسی طرح صنعتی مشاغل میں عورتوں کی شرکت کے ساتھ ساتھ یہ امر ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ اسلام نے خاندانی نظام کی پائداری اور استحکام پر بڑا زور دیا ہے اور عورتوں کے گھریلو فرائض کو دیگر تمام فرائض پر مقدم رکھتا ہے۔ اس لئے دفاعی، صنعتی، اور طبی کاموں میں عورتوں کو اس طرح شریک کرنا درست نہیں ہے کہ وہ اپنے عائلی فرائض میں کوتاہی کرنے لگیں۔ اس مقصد کے لئے حکومت اوقات کار کا تعین اس طرح کر سکتی ہے کہ عورتوں کو وقت و فرصت کا زیادہ حصہ گھر ہی پر گزارنا پڑے، اسی کے ساتھ ان عورتوں کو ایسے کاموں میں شرکت کی اجازت نہیں

دینی چاہیئے، جن پر اولاد کی تربیت، نگرانی اور پرورش کا بھاری بوجھ ہو، مثلاً جن عورتوں کے دو تین بچے چھوٹے ہوں اور جن کے یہاں پیدائش اولاد کا سلسلہ جاری ہو، انھیں ایسے کاموں سے منع کر دینا چاہیئے۔ اسی طرح نابالغ اور بالغ لڑکیوں کو جو تعلیم میں مصروف ہوں صرف تھوڑے سے وقت کے لئے ان کاموں میں شریک ہونے کی اجازت دینی چاہیئے۔ البتہ جن عورتوں کے بچے بڑے ہو گئے ہوں یا جنھیں آئندہ اولاد کی توقع نہ ہو وہ صنعتی اور دفاعی مشاغل میں زیادہ وقت صرف کریں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ جو عورتیں اس قسم کے مشاغل میں حصہ لیں انھیں وہ تمام مخصوص مراعات اور سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں جو آجکل کے مہذب ممالک میں عورتوں کو دی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر اسلام کے بنیادی مقاصد مثلاً خاندانی نظام کی پائداری اور عصمت و عفت کی حفاظت وغیرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں تو عورتوں کو موجودہ قیود و بند سے آزاد کر کے قومی اور اجتماعی فرائض میں ان کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کی تبدیلیاں اسلامی نقطۂ نظر سے نہ صرف ناقابل اعتراض نہ ہوں گی بلکہ اسلامی احکام کے عام منشا کے مطابق ہوں گی۔

ختم شد